جیون دان

سیتل سنگھ

جے کے بک ہاؤس
ریزیڈنسی روڈ۔ جموں (توی)

بارِ اوّل : ۱۹۸۴ء

کتابت : ماجد خاں

سرورق : فضیلت

مطبع : (فوٹو لیتھو ورکس سیماپوری دِلّی ۳۲)

قیمت : -/۳۵ روپے

ناشر : جے۔ کے۔ بک ہاؤس

ریزیڈنسی روڈ۔ جموں توی

T... NDAAN : SITAL SINGH

: PRICE RS 35/-

عدالت کے اندر اور باہر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اخباروں کے رپورٹرز، فوٹوگرافرز اور عام تماشائی سب اُس نوجوان کی قسمت کا فیصلہ سُننے کے لئے بے چین تھے۔ نوجوان پر خون کا الزام تھا یعنی اُس نے کسی کی زندگی کو مٹا کر بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ اور قانون کی نظر میں بہت بڑا جرم۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی زندگی مٹانے کا حق قطعی حاصل نہیں۔ وہ تو اُسی کو ہے جو خود اپنے ہاتھ سے کسی کی زندگی بناتا ہے۔ جو کوئی اس کا بندہ اُس کے بنائے ہوئے اصول کو مٹا کر ایسا ذلیل کام کرتا ہے۔ قدرتی طور پر وہ ایک جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور۔۔۔۔ ایسے ہی ایک بدنصیب نوجوان قاتل کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا تھا۔ تاکہ اُسے عدالت اپنے کئے کی سزا دے۔ اسی قاتل کے دیدار اور انجام نے ہزاروں لوگوں کو جمع کیا تھا۔ ابھی جج صاحب کے آنے میں وقت تھا۔ اس لئے لوگ آپس میں کانا پھوسی کے انداز میں اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے۔ کسی نوجوان نے سینہ ٹھونک کر کہا تھا۔ "بھلا پھانسی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں نوجوان بے قصور ہے۔ آخر میں بھی تو وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔" کئی تماشائی اُس کی باتیں سُن کر

ہنس پڑے تھے اور کسی نے اُس کا مذاق اُڑایا۔

پھر ایک بڑے میاں نے اپنے منہ اور ناک میں نسوار اچڑھا کر پہلے تو چاروں اور ایک گہری نگاہ ڈالی اور منہ کھولا تھا۔ نسوار بھری تھوک ان کے منہ سے نکل کر کئی ایک کے کپڑوں پر پھیل گئی تھی اور انھوں نے بُرے بُرے منہ بنائے تھے۔ بڑے میاں فرمانے لگے تھے۔ "بھئی۔ جُرم کرنا تو واقعی شرم کی بات ہے۔ اب دیکھو کیسا ہٹا کٹا جوان ہے لیکن ایک مجرم کی شکل میں۔ بھلا اس کو بے قصور کیسے مان لیا جائے"

میاں جی کچھ اور بولتے لیکن اُسی وقت جج صاحب کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ عدالت میں موجود سبھی لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے تھے۔ ادھیڑ عمر جج نے کرسی سنبھالی اور پھر وکیل سرکاری کی اور غور سے دیکھنے لگے۔

عدالت میں خاموش ہو کر لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ وکیل سرکاری مسٹر گپتا کھڑے ہو کر پہلے جج صاحب کے سامنے ادب سے جھک گئے اور پھر انھوں نے اپنی موٹی سی عینک آنکھوں پر درست کی اور منہ کھولا۔

"یور آنر آج کی عدالت میں ایک نوجوان قاتل کو پیش کیا جا رہا ہے۔ جس نے تعلیم یافتہ ہو کر بھی ایک قتل کیا ہے۔ آج کے اس دور میں جبکہ تعلیم انسان کو نئی روشنی دکھاتی ہے۔ تہذیب و تمدن سکھاتی ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کے ہاتھوں قتل۔ کتنی بڑی غیر قانونی اور شرم کی بات ہے۔ یور آنر۔ نوجوان فوج کا ایک سپاہی بھی ہے وہ سپاہی جو اپنے دیش کا رکھوالا اور نگہبان ہوتا ہے۔ اُسی کے ہاتھوں اپنے ہی ایک دیش واسی کا خون۔ کتنا بڑا جرم ہے"

سرکاری وکیل کے خاموش ہونے کے ساتھ ہی قاتل کو عدالت کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایکبارگی سب لوگوں کی نگاہیں اُس خطرناک نوجوان کی اور اُٹھ گئیں تھیں۔ پھر لوگوں میں سرگوشیاں سی ہونے لگی تھیں۔ وہ نوجوان عدالت میں ایسے

کھڑا تھا جیسے سرحد پر کھڑا کیا گیا ہو۔ یہی کوئی پچیس چھبیس سال کا لگتا تھا مضبوط اور خوبصورت جسم کا مالک۔ گھنے کالے چمکیلے بال اُس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اُس کے چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی اور اُس انداز میں ایک قاتل ہونے کے بھی وہ۔ بالکل معصوم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اور آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو چلے تھے جیسے وہ دیر سے رو رہا ہی رہا ہو۔

مسٹر شرما سرکاری وکیل نے نفرت سے نوجوان کی اور دیکھا اور پھر جوش بھری آواز سے کہنے لگے تھے "ملزم دیپک کمار حاضر ہے یور آنر۔ اِس بے رحم نوجوان نے مقتول رتیش کمار کی جان لے لی۔ پولیس اِسے جائے واردات پر ہی گرفتار کر چکی ہے۔

ملزم دیپک کمار مقتول رتیش سے دشمنی رکھتا تھا۔ رتیش نے اُس کی بہن پر تھوڑی زیادتی کی تھی۔ ملزم دیپک کمار نے بڑی بے دردی سے مقتول کے پیٹ میں چھرا گھونپا۔ انسپکٹر شرما جس وقت اِسے گرفتار کرنے کے لئے موقعہ پر پہنچ گئے تھے۔ دونوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہ تھا اور ظاہر ہے کہ دونوں میں پہلے مار پیٹ ہوئی تھی اور پھر ملزم نے موقعہ پا کر مقتول کو چھرا گھونپا۔ یور آنر۔ یہ صاف قتل کی واردات ہے"۔

ادھیڑ عمر جج نے سرکاری وکیل کے خاموش ہوتے ہی ملزم پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ اُسے لگا کہ وہ نوجوان یا تو سچ مچ معصوم ہے یا بہت چالاک۔ پھر اُن کی بارعب آواز عدالت میں گونجی تھی۔

"ملزم دیپک کمار تم پر ایک قتل کا الزام ہے۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو"

اُس نوجوان نے پہلی بار عدالت کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اُس کی باتیں سننے والے کتنے لوگ موجود ہیں۔ تاکہ اس کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں کے کانوں میں پڑ سکے۔ پھر اُس نے ایک اکڑ کے ساتھ سرکاری وکیل کو دیکھا تھا اور افسردہ سی آواز میں بولنا شروع کیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ میں ایک قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر عدالت میں کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن میں ایک ہی بات عدالت سے بیان کروں گا کہ میں نے مقتول کو نہیں مارا۔ میں نے اس کے پیٹ میں چھرا نہیں گھونپا۔ حالانکہ میری تمنّا تھی کہ میں اُسے ختم کردوں۔ میں اُسے کڑی سے کڑی سزا دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں اُسے نہیں مار سکا۔ وہ خود اپنے ہی چھرے سے ہلاک ہو گیا۔ اور میں نے اس پر وار نہیں کیا"

"نوجوان" جج نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو"؟

"یور آنر میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور اب پولیس مجھے قاتل ٹھہرا چکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیوں؟ جج صاحب کاش میں نے یہ نیک کام انجام دیا ہوتا۔ آپ نہیں جانتے رشی جیسے انسان کو مارنا پُنیہ کرنے کے برابر تھا۔ وہ بہت بڑا گنہگار تھا جو خود ہی ختم ہو گیا۔"

مسٹر گپتا وکیل سرکاری کو دیپک کی یہ باتیں کڑوی لگیں۔ کیونکہ ایک سرکاری وکیل کا کام تو ہر اُس شخص کو جسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے ملزم ٹھہرانا ہوتا ہے۔ تاکہ اُسے عدالت اُس کی سفارش پر سزائے موت یا عمر قید بخش دے۔ سرکاری وکیل کو کسی اور بات سے کوئی سروکار نہیں۔ نوجوان ملزم کی باتیں سُن کر مسٹر گپتا جل کر راکھ ہو گئے۔ اُنھوں نے گھور کر دیپک کمار کی طرف دیکھا جیسے اُسے کاٹ کھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ لیکن دیپک کمار کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اُس کا چہرہ کسی بھی جذبے سے خالی تھا۔

"قاتل دیپک کمار عرف ریپو" مسٹر گپتا دہاڑ کر بولے تھے۔

"صرف دیپک کمار سرکاری وکیل صاحب۔ عدالت نے مجھے ابھی قاتل قرار نہیں دیا۔ پھر آپ مجھے کیسے قاتل کہہ کر پکار سکتے ہیں۔" وہ نوجوان جوش میں سرکاری وکیل کو ٹکا سا جواب دیکر بولا۔ اور مسٹر گپتا غصّے سے آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ اپنے غصّے کو

قابو کرتے ہوئے مسٹر گپتا نے پھر دیپک کمار سے سوال کیا تھا۔
"تم فوج میں سپاہی ہو؟"
"جی ہاں جناب۔ دُور سرحد پر اپنے جان کی بازی لگا رہا ہوں۔"
"ایک سپاہی ہونے کے ناطے تم پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی ہے؟" مسٹر گپتا نفرت سے ناک سکوڑ کر بولے تھے۔
دیپک کمار مُسکرایا تھا۔
"اگر میں ایک سپاہی نہ بھی ہوتا تو بھی خود کو دیش کے لئے قربان کر ڈالتا۔"
"تم غلط بول رہے ہو۔" سرکاری وکیل بھری عدالت میں چلّا پڑے تھے۔
"تم نے اپنا خون بہانے کی بجائے کسی اور کا خون بہایا ہے۔ تم نے خود کو وطن پر مٹانے کی بجائے کسی دوسرے کی زندگی مٹا دی ہے۔ ایک سپاہی دیش کا سچا سپوت ہوتا ہے۔ لیکن تم انسان نہیں ایک درندے ہو۔ تم نے بہت بڑا گناہ اور جرم کیا ہے۔ تم کو سخت سزا ملنی چاہیئے۔ میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ تم جیسے خونی کو سزائے موت دیدی جائے تاکہ لوگ جان سکیں کہ کسی کی زندگی چھیننا کتنا بڑا جرم ہے جس کی تلافی زندگی دے کر ہی کی جا سکتی ہے۔"
اس سے پہلے کہ مسٹر گپتا سرکاری وکیل مزید بولتے۔ دیپک کمار کا چہرہ لال ہوتا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔ اور پھر وہ چلّا کر ساری عدالت سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہاں ہاں مجھے سزائے موت دیدو۔ اور دے بھی کیا سکتے ہو تم۔ یہ دنیا۔ سماج، اور یہ قانون مجھے آج تک موت ہی دیتی آ رہی ہے۔ کیا دیا ہے آپ سب نے مجھے میرا سب کچھ دیش کی راہ میں لُٹ گیا۔ میری ماں جس نے کہ مجھے جنم دیا تھا۔ دن رات خون پسینہ ایک کر کے مجھے پالا پوسا اور لکھایا پڑھایا تھا۔ وہ بہن جو مجھے ہر رکھشا بندھن کے روز راکھی

باندھا کرتی تھی تاکہ مجھے بھائی بہن کے رشتے کی یاد دلاتی رہے۔ اور وہ باپ جس کا خون میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ وہ سب مٹ گئے دیش کے لئے۔ اب باقی کیا رہا ہے میرے پاس۔ میں خود اب اس خود غرض دُنیا میں جینا نہیں چاہتا" وہ نڈر اور جوشیلا مُلزم ایسے بول رہا تھا جیسے اُس کے سارے بدن سے لاوا سا اُبل کر آ رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ بھری عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ روتے روتے ہی وہ پھر بھری عدالت سے مخاطب ہوا تھا" میرے گھر کو راکھ بنا دیا گیا۔ میری ماں، بیمار ماں کو آتنا پیٹا اور مارا گیا کہ وہ ایک بار گر کر پھر نہ اُٹھ سکی تھی۔ میری چھوٹی معصوم اور غریب بہن کی عزت لوٹ لی گئی اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی۔ میرے عظیم باپ نے غیر قانونی کام کرنے سے انکار کیا تھا۔ تو اُسے سر بازار گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اور میں دُور بہت دُور اپنے دیش کی سرحد پر اپنی جان کی بازی لگاتا رہا تھا۔ بولئے، آپ نے، آپ کے قانون نے میرے لئے کیا کیا۔ آج بھارت کے لاکھوں جوان سرحدوں پر گھروں سے دور جان کی بازی لگا رہے ہیں تو کیا آپ کا قانون اور سماج اُن کے گھروں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ جواب دیجئے مجھے جس قانون نے مجھے قاتل ٹھہرا کر گرفتار کر لیا ہے۔ وہ قانون اُس وقت کہاں گیا تھا جب میرا سب کچھ لُٹ رہا تھا۔ میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی درندہ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے تو آپ کیا کریں گے؟ وہ درندہ جو سماج کے لئے ایک کیڑا تھا۔ جو اپنی بہن کو بھی نیلام کر بیٹھا۔ اُس گندے اور ذلیل آدمی نے جانے کتنے گھر برباد کر ڈالے تھے۔ میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کیا ایسے آدمی کو ختم کرنا پاپ ہے۔ نہیں۔ اگر سماج میں پھیلی ہوئی گندگی دور کی جائے تو وہ کام کرنا پاپ نہیں پُنّیہ ہے۔ چاہیئے تو تھا۔ قانون کو ایسے انسانوں سے دیش کو مُکتی دلانا لیکن آج کے قانون میں جانے کیوں دم نہیں رہا۔ بھارت کا ہر فرد اپنی جگہ قانون کا محافظ ہے۔ اور ہر ایک کو اپنی حفاظت خود کرنی چاہیئے۔ میں اپنے ہاتھوں سے رمیش کو مار نہیں سکا جس کا مجھے افسوس رہا ہے۔

وہ تو وہ اپنے ہی وار سے ختم ہو گیا تھا۔ اب اگر مجھے ملزم ٹھہرایا جا رہا ہے تو کیسے؟ میں مانتا ہوں انسپکٹر صاحب نے مجھے جائے واردات پر ہی گرفتار کر لیا تھا لیکن انھوں نے مجھے مقتول پر وار کرتے تو نہیں دیکھ لیا تھا۔ پھر قانون اور پولیس مجھے قاتل ٹھہرا رہی ہے۔ میں حیران ہوں۔"

ساری عدالت کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اور جج صاحب تو سناٹے میں بیٹھے رہ گئے تھے۔ سبھی ہکا بکا ہو کر ملزم کی اور دیکھنے لگے تھے۔ ادھیڑ عمر جج کی نظروں سے آج تک سیکڑوں مجرم گزرے تھے لیکن آج ۔۔۔ آج جس مجرم کا انصاف کرنے جا رہے تھے وہ۔ وہ انھیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

وکیل سرکاری مسٹر گپتا کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے بس کسی بھی طرح اس نوجوان کو سزا دلوا دیں اور کیس بند ہو جائے ۔۔۔ اپنے بھاری چشمے کو ایک بار پھر انھوں نے آنکھوں پر ٹھیک کرتے ہوئے نوجوان سے سوال کیا تھا۔

"نوجوان۔ عدالت میں تقریر کی شکل میں تم نے اب تک جو بھی بولا ہے ان باتوں میں کہاں تک سچائی ہے ہم نہیں جانتے۔ لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ تم نے مقتول کو قتل کیا۔ پھر اب تم مقتول پر جھوٹے الزام لگا کر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی جو کوشش کر رہے ہو۔ وہ فضول ہے۔ تم گنہگار ہو اور تم کو ہر حالت میں سزا ملنی ہی چاہیے۔"

"سرکاری وکیل صاحب" نوجوان جوش میں بولا تھا۔ "میں نے ساری زندگی میں ایک بار بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا اگر عدالت مجھے اس بات کی اجازت دے کہ میں بیتی ہوئی زندگی عدالت کے سامنے رکھ سکوں۔ مجھے امید ہے پھر آپ مجھے جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔"

جج صاحب نے غور سے دیپک کمار کی بات سنی۔ ایک کریدہ۔ ایک خواہش سی

اُن کے دل میں اُٹھی کہ وہ نوجوان اپنی ساری زندگی عدالت کے سامنے رکھ دے اُنھیں وہ نوجوان کوئی معمولی نوجوان نظر نہیں آیا تھا ـــــ

"چونکہ کیس کچھ اُلجھ سا گیا ہے اور ملزم پر قتل کا الزام ہے۔ عدالت بغیر پورے ثبوت ہونے کے کسی بے قصور کو سزائے موت نہیں دے سکتی۔ یا اُسے عمر قید کی سزا نہیں دے سکتی۔ اس لئے نوجوان تم اپنی بیتی ہوئی زندگی عدالت کے سامنے رکھ سکتے ہو۔ اس طرح ہو سکتا ہے حالات پر کچھ روشنی پڑ سکے"۔

سرکاری وکیل مسٹر گپتا بُرا سا منہ بنا کر کرسی پر دراز ہو گئے اور عدالت میں موجود سبھی لوگوں کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ ساری عدالت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ لوگ بیقرار اور بیتاب ہو کر نوجوان کو دیکھنے لگے تھے اور دیپک کمار اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ معصوم سا لگنے لگا تھا۔ اُس کے چہرے پر معصومیت پھوٹ پھوٹ کر برسنے لگی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کوئی بچہ بن گیا ہو۔ اور پھر وہ ماضی کی یادوں میں کھوتا چلا گیا تھا۔

"یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مقتول رمیش کمار اور میں ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی جماعت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ میں اُن دنوں کوئی دس گیارہ سال کا بچہ تھا اور رمیش بھی لگ بھگ میرا ہم عمر ہی تھا۔ رمیش کے پتا رائے صاحب شہر کے امیر آدمیوں میں شمار کئے جاتے تھے اور میرے باپو اُن کے پاس منیم کی نوکری پر رکھے گئے تھے۔

مجھے لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور اس کے برعکس رمیش کھیل کود میں مصروف رہتا تھا۔ اُسے چڑ تھی کہ میں سب کا پیارا کیوں تھا اور ہر وقت پڑھتا ہی کیوں رہتا تھا۔ اسی بات پر ہماری روز جھڑپ ہوتی رہتی۔ میں اُس کے کسی بھی روعب میں نہیں آتا تھا۔ اس لئے وہ جلتا تھا اور میری جھوٹی شکایت اپنے باپ سے کرتا رہتا تھا۔ رائے صاحب میرے باپو کو پھٹکارتے اور مجھے پھر گھر میں مار کھانی پڑتی تھی ـــــ

اُس دن ـــــ دھیرے دھیرے دیپک کمار کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ماضی

میں ایک بار پھر سے لوٹ آیا۔ لگ رہا تھا وہ سو گیا ہو لیکن اُس کے ہونٹ پھر بھی ہل رہے تھے۔ ——— ساری عدالت میں خاموش سنّاٹا چھا گیا تھا۔ لوگ کرسیوں میں جم سے گئے تھے اور سب کے سب دیپو کی بیتی ہوئی زندگی میں کھو گئے تھے۔

اُس دن ابھی اسکول کی گھنٹی بجنے میں تھوڑا وقت باقی تھا۔ اور دیپک اس وقت کو فضول ہی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ایک علیحدہ گوشے میں بیٹھا اپنی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اُس نے کتاب کھولی تھی اور پہلے صفحہ پر لکھے راشٹریہ گیت کو گنگنا رہا تھا۔ اُس نے کہا وہ راشٹریہ گیت۔ جس کی ہم جتنی بھی عزت کریں کم ہے۔ یہ گیت اسکولوں کی ہر کتاب پر سب سے پہلے ورق پر درج ہوتا ہے سینما ہالوں میں شو کے خاتمہ پر اس کی گونج اُٹھتی ہے لیکن ہم۔ ہم اس کی عزت نہیں کرتے۔ کئی سیٹوں پر دراز ہوتے ہیں تو کئی دروازہ کھول کر نکل بھاگنے کی فکر میں۔ رات کو ریڈیو بند ہوتے وقت بھی یہ نغمہ سُنائی پڑتا ہے اور لوگ اس کی عزت سوتے ہوئے خراٹوں کی شکل میں کرتے ہیں۔ جن ورقوں پر یہ گیت لکھا ہوتا ہے وہ ورق آج سڑکوں پر گلی کوچوں میں گندگی کے ڈھیروں پر پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے والے تو کئی ایک ہیں اور یہ گیت کتنا عظیم ہے؟ وہ لوگ جانتے ہیں جن کو دیش سے پیار ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی دیپک بھی تھا۔ وہ اِس گیت کی دل و جان سے عزت کرتا تھا۔ کرتا بھی کیوں نہ۔ آخر اُس کی ماتر بھومی کا راشٹریہ گیت جو تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسی گیت کو دل

دماغ میں بسائے گنگناتا جا رہا تھا کہ اُس کی نظریں سامنے کی اور اُٹھ گئیں۔ ریشی کچھ دیگر لڑکوں کے ساتھ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ دیپک نے ریشی کو دیکھ کر بُرا سا مُنہ بنایا تھا اور بے زاری سے اپنی نظریں دوسری اور پھیر لی تھیں۔ اتنے میں ایک لڑکے نے آکر دیپک سے کتاب چھین لی تھی اور پھر ہنستے ہوئے بولا تھا "کب سے تجھے کھوج رہے ہیں دیپو اور تو ہے کہ یہاں بیٹھا دماغ خراب کر رہا ہے۔ آ، اُٹھو کبڈی کھیلیں۔"

"نہیں مجھے کھیلنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ ہر وقت کھیلنے کا کیا مطلب۔ آج یہ گیت ضرور یاد کرنا ہے۔ دیکھتے نہیں ماسٹر جی روز ڈانٹتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا تھا۔

"ہونہہ" نفرت سے ناک سکوڑ کر پھر اُسی لڑکے نے کہا تھا۔ "اِس گیت میں رکھا کیا ہے جو یاد کر لیا جائے۔ ارے کوئی فلمی گانا ہوتا تو بات تھی جیسے "میرا نام راجو گھرانہ ہے نام۔"

اُس لڑکے کی بات دیپو نے کاٹ دی اور دُکھ بھرے لہجہ میں بولا تھا "تم ماسٹر جی کی بے عزتی کر رہے ہو۔" اُس کے جی میں آیا تھا کہ اُس لڑکے کا مُنہ نوچ لے لیکن وہ اُسے پھر سے ایک بار سمجھانے لگا تھا "اِسی گیت میں ہماری تقدیر ہے۔ ماسٹر جی روز کہتے ہیں اس گیت کو دل و دماغ میں بسا لو۔"

ریشی کو دیپک کا یہ انداز بالکل نہیں بھایا تھا۔ اُس کو بہت غصہ آیا۔ دیپو کی یہ مجال کہ وہ اُسے نصیحت کرنے لگے۔

"چل بے رادھو۔ فضول وقت ہی برباد کر ڈالا میرا۔ ہونہہ بڑا آیا لاٹ صاحب نصیحت کرنے والا۔" ریشی نے تیکھے پن سے کہا تھا اور پھر نفرت بھری نگاہ دیپک پر ڈال کر چلا گیا تھا۔ سب لڑکے کھڑے رہ گئے تھے اور دیپک اُن کی اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

تبھی اسکول کی گھنٹی بج گئی تھی۔ دیپک بھی اُٹھ کر کلاس میں چلا گیا تھا۔

ماسٹر جی نے ایک لڑکے کی اُور اشارہ کر کے بولا تھا۔

"بنٹو۔ کیا تمہیں معلوم ہے ہماری سب کی ماں کون ہے۔"

"ہاں ماسٹر جی۔ وہ تو مجھے روز لڈو کھانے کو دیتی ہے۔ کہتی ہے جتنا کھاؤ گے اتنا ہی بڑے ہو جاؤ گے۔ ماسٹر جی میں نے سوچ لیا ہے میں ایک ہی بار سب لڈو کھاؤں گا اور چھوٹا پیٹ بڑا ہو جاؤں گا۔"

سارے کلاس میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا اور ماسٹر جی بنٹو کو گھورنے لگے تھے۔ "نالائق۔ بیوقوف صرف کھاتا رہتا ہے۔ پڑھنا کچھ نہیں۔"

"دیپک۔"

"جی ماسٹر جی۔" دیپک عزت سے کھڑا ہو کر بولا تھا۔

"تم بولو۔ تمہاری ماں کون ہے۔"

"وہی میری ماں ہے جسے میں ماتر بھومی کہتا ہوں۔"

"شاباش۔ تم بڑے بھلے لڑکے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم جس کی کوکھ سے پیدا ہوئے وہ تمہاری جنم دینے والی ماتا ہے لیکن بچو اُس جنم بھومی کو مت بھولو جس نے تم کو رہنے کو

جگہ دی۔ کپڑا دیا اور کھانے کو روٹی دی۔ وہی تمہاری ماں ہے۔ ہم سبوں کی ماں"۔ بولو ماتر بھومی کی جے"۔

سارا کلاس روم ماتر بھومی کی جے کی آواز سے گونج اُٹھا تھا۔

اور تبھی اسکول کی گھنٹی بھی بج گئی تھی اور ماسٹر جی کے نکلتے ہی سب لڑکے نکل گئے تھے۔ دیپک بھی کتابوں کا بستہ لے کر گھر کی اور چل پڑا تھا۔ سڑک پر نکلتے ہی اُس کی نظر زمین پر پڑے کاغذ کے ورق پر پڑی اور وہ اُسے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہی راشٹریہ گیت اُس کا پیارا گیت، اُس کی ماتر بھومی کی آواز، ہم سبوں کی آواز، بھارت کی آواز۔ کسی لڑکے کی کتاب سے کٹ کر سڑک پر گر پڑا تھا۔ وہ ورق اور نہ جانے دھول میں۔ ایک دھکّہ سا لگا دیپک کو۔ اس کا دل غم سے بھر گیا۔ جھک کر اُس نے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور پھر اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے جھٹ اُس کاغذ کو چھاتی سے لگانا چاہا تھا لیکن تبھی کسی کے ہاتھ نے اُس کاغذ کو جھپٹ کر چھینا۔ یکایک اُس کی نگاہیں اوپر اُٹھیں۔ اس نے رمیش کو دیکھا۔ اور پھر اُس کے سامنے ہی رمیش نے اُس کاغذ کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اُچھال دیئے تھے۔

دیپک کا خون کھول اُٹھا تھا۔ اُس کا غصّے کے مارے بُرا حال ہو گیا ——— ماتر بھومی۔ اُس کی جنم بھومی ماں کی ایسی بے عزتی۔ راشٹریہ گیت کا یہ اپمان اُسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اور دوسرے ہی لمحہ چٹاخ کی آواز ہوئی اور اُس کا بھرپور تھپّڑ رمیش کے گال پر پڑا تھا۔

"میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ ایسے ہی جیسے تو نے اِس کاغذ کے کئے ہیں۔ ذلیل"۔

رمیش ہکّا بکّا سا کھڑا رہ گیا۔ اُسے اُمید نہ تھی کہ آج پھر دیپک اُسے مارے گا۔ اور اُس کے ایک نوکر کا لڑکا اُس کی توہین کرے گا۔ لیکن پھر بھی وہ چُپ رہا اور اُس کی

ہمّت دیپک سے لڑ پڑنے کی نہ ہوئی۔ صرف جوابی حملہ اُس نے باتوں سے ہی کیا تھا۔ "دیکھ لوں گا۔" "تو کتنا لاٹ صاحب بنا بیٹھا ہے ابھی پتاجی سے جاکر بولتا ہوں پھر دیکھنا ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔" رمیش نے نفرت سے گھورتے ہوئے دیپک سے کہا تھا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دیپک کا غصّہ جو ہی ٹھنڈا ہوا۔ وہ سہم گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ رمیش روتا ہوا باپ کے پاس جائے گا اور پھر اُسے لاتوں کی بارش دیکھنی پڑے گی۔ اِسی سوچ میں وہ بھی گھر کی اور چل پڑا تھا۔

رمیش کے پتا رائے صاحب اِس شہر کے مانے ہوئے رئیس تھے۔ سماج میں بڑی عزت رکھتے تھے۔ اُن کے پاس بے شمار دولت تھی۔ رمیش کے علاوہ اُن کی ایک بیٹی بھی تھی۔ کرن۔

کرن ابھی کمسِن تھی۔ مشکل سے آٹھ سال کی رہی ہو گی۔ لیکن ماں کی موت کے بعد اُس کمسِن کو بھی دنیا کے بہت سے تجربے ہونے شروع ہوئے تھے۔ دیپک کا باپو شیام لال رائے صاحب کے یہاں دس سال سے منیم تھا۔ رائے صاحب کی شاندار کوٹھی شہر سے الگ تھلگ واقع تھی۔ یہ جگہ ابھی سرکار سے نئی کالونی منظور ہوئی تھی۔ روپ نگر اس کا نام رکھا گیا تھا۔ اِس کالونی میں درمیانی اور نچلے طبقہ کے لوگ بھی رہائش پذیر تھے۔ کیونکہ وہ اِس جگہ پہلے سے ہی رہتے آ رہے تھے۔ رائے صاحب کے بنگلہ کے پاس ہی شیام لال نے ایک منزلہ کوارٹر جیسا گھر تعمیر کیا تھا۔ جو کچھ رائے صاحب سے ملتا تھا۔ اُسی پر اِن لوگوں کی گزر ہوتی تھی۔ دیپو کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ جمنا۔ اور اس کے علاوہ گھر میں گھر کی مالکن بھی تھیں۔ دیپو اور جمنا کی ماں سُندری۔ بس یہی تھا دیپک کے گھر کا گزر کہ منیم کی نوکری سے جو کچھ ملتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ شیام لال اور سُندری کو بڑے ارمان تھے کہ

دیپک کو پڑھائیں لکھائیں تاکہ وہ بھی بڑا آدمی بن سکے اور اُن کی بڑھاپے میں کچھ خدمت کر سکے۔ اسی خیال کے مدِ نظر وہ بھوکے رہتے لیکن اُس کی پڑھائی کی اُور زیادہ دھیان دیتے تھے۔

جونہی دیپک گھر میں داخل ہوا تھا جمنا دوڑ کر دیپک سے لپٹ گئی تھی۔ اُسے بھائی سے بہت پیار تھا۔ ابھی کم سِن تھی معصوم تھی۔

"بھیّا آ گئے۔ بھیّا آ گئے۔ لاؤ ہمارے لئے کیا لائے ہو۔"

"ہٹو جمنا مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ چھوڑو۔" وہ بے رُخی سے بولا تھا۔

"تم تو ایسے بول رہے ہو جیسے اندر لڈّو کھانے ہیں۔"

دیپک ابھی منہ میں آئے ہوئے پانی کو نگلنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اندر سے اُس کی ماں سُندری آئی۔ ماں کو دیکھ کر دیپک کا دل ایکبارگی دھڑک اُٹھا۔ اُس کے دل کا چور سہم گیا۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں ماں کو سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا۔ اور اُس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ سُندری ماں نے اُس کی گھبراہٹ کو بھانپ لیا اور پھر خود ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ اُس کے دل میں بھی دھک دھک ہونے لگی۔ شاید دیپو آج پھر دنیش سے جھگڑ کر آیا ہے۔

"تو آج پھر دنیش سے لڑ کر آیا ہے۔" سُندری ماں نے اُسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں تو جانتی تھی روز روز کی مار کا تجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

دیپو سہم گیا تھا۔ وہ جان گیا کہ اُس کی چوری پکڑی گئی ہے اور دنیش نے گھر جا کر اُس کی شکایت کر دی ہے۔ اُس کا سر خود بھی جھکتا چلا گیا اور سُندری اور بھی جھلا گئی تھی۔ دیپک کے دونوں کان پکڑ کر وہ چلّا کر بولی تھی۔ "بول۔ کیوں مارا تو نے دنیش کو۔ کیا تو ہم کو بے موت مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اچھا تھا تیرا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیتی۔ اب چپ کیوں ہے بولتا کیوں نہیں۔" اور پھر چٹاخ چٹاخ دیپک پر تھپڑوں کی بارش ہونے لگی

تھی۔ دیپک پٹ رہا تھا۔ جمنا دور کھڑی خوفزدہ نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پھر دیپک بھر بھرا کر رو دیا تھا۔

"ماں۔ مجھے مت مارو۔ میں نے جان بوجھ کر اُسے نہیں مارا۔ وہ خود"۔۔۔۔۔

دیپک کی بات کو ماں نے بیچ ہی میں کاٹ دیا تھا۔ "یہی نا کہ اُسی نے ہی پہل کی تھی۔ تو سوچتا کیوں نہیں بے ابھاگے۔ مورکھ۔ تیرا باپو اُسی کے رحم و کرم پر ہے۔ ہم سب اُنہیں کا دیا ہوا کھاتے ہیں۔ سیٹھ جی کئی بار تمہیں معاف کر چکے ہیں۔ میں نے سیٹھ جی کے پاؤں پڑ کر معافی مانگی تھی۔ اب تو بھگوان کا ہی آسرا ہے۔

تو نے اپنے ساتھ ہم کو بھی مٹانے کی قسم کھائی ہے۔ میں کیا کروں بھگوان"۔ کہتے کہتے ماں خود پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دیپک وہاں نہیں ٹھہرا تھا۔ اندر والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ دیوار پر ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا بھارت کا نقشہ ٹنگا ہوا تھا۔ دیپک غور سے اس بے جان رنگے ہوئے کاغذ کو دیکھنے لگا تھا۔ اپنی ماترِ بھومی کی تصویر اُسے نظر آئی تھی۔ دیپک نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھرّائے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔

"ماں۔ جنم بھومی ماں۔ دیکھتی ہے نا تو۔ میں تیرے لئے کیا کچھ کرتا ہوں اور لوگ اُلٹا مجھے ہی کوستے رہتے ہیں۔ میں کیا کروں ماں۔ مجھ سے تیری بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔ بول نا ماں۔ تو چپ کیوں ہے ماں"۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ اتنے میں اُس کے باپو شیام لال کی آواز دیپک کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی سہم گیا تھا۔

"وہ کیا بول سکتی ہے مورکھ۔ اب میں۔ میں تجھ سے بولوں گا"۔ پھر شیام لال بھارت کے اُس پرانے نقشے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

"اسی کاغذ کے نقشے نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے دیپو۔ اسی نے ہمارا سکھ چین سب چھین لیا ہے۔ آج میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا"۔ اور پھر شیام لال نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیئے تھے۔ پھر دیپو کی اور لال پیلی آنکھوں سے گھورتے ہوئے

کہا تھا" بول۔ اب تو اُن کاغذ کے ٹکڑوں سے بول۔ مانگ اِن سے روٹی دیپک۔ تو اپنی جنم بھومی سے مانگ ہمارے لئے کپڑے۔ بول اِس سے کہ وہ تیری اسکول کی فیس دیدیں۔ دیپو اب تجھے روٹی کے لئے ترٹپنا پڑے گا۔ تو اسکول بھی نہیں جا سکے گا۔ تو نے کسی اندھے ارادے کے خاطر ہم سب کا سکھ چین لوٹ لیا دیپو۔ تو نہیں جانتا پگلے۔ آج تن ڈھانپنے کے لئے ماتر بھومی کی پوجا نہیں کی جاتی ہے بلکہ سماج کے اُن لوگوں کی پوجا کی جاتی ہے جو ہم کو روٹی اور کپڑا دیتے ہیں۔ سمجھے۔" اس کے بعد شیام لال بغیر کچھ کہے سُنے باہر مُڑا تھا اور پھر گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حمینا بلکتی ہوئی آ کر دیپک سے لپٹ گئی تھی! اُس کو اپنے بھائی سے بہت پیار تھا۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

کرن رائے صاحب کی بیٹی ہی اُس گھر میں ایک واحد فرد تھی جس کو دیپک کے گھر سے ہمدردی اور پیار تھا۔ لیکن وہ کم سن تھی اور اُسے بھی اِن باتوں کے لئے ڈانٹا جاتا تھا۔ جب سے کرن نے ہوش سنبھالا تھا اُس نے اپنے آپ کو اسی گھر کے ماحول میں پایا تھا۔ وہ پلی بڑھی تھی۔ دیپک کے گھر میں ہی اور اِسی وجہ سے اُسے دیپک سے خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ وہ دیپک سے روز ملتی، اُسے چھیڑتی اور روز نئے مذاق کرتی رہتی۔ دیپک کو بھی کرن سے محبّت تھی۔ گو دونوں ابھی چھوٹی عمر ہی کے تھے لیکن بچپن کی محبّت پُرخلوص اور سچّی ہوتی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ پلے بڑھے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے پکّے ساتھی تھے۔ کرن روزانہ اُس کے گھر آتی۔ جمنا کے ساتھ گڈّا گڈّی کا کھیل رچاتی۔ دیپک کو چھیڑتی اور سندری ماں کی گود میں بیٹھ کر ماں کا پیار پاتی۔

جب اُس نے یہ سُنا کہ دیپک کے پِتا نوکری سے ہٹا دیئے گئے اور وہ لوگ اب مصیبت میں ہیں، تو کرن کو بہت دُکھ ہوا۔ وہ چپکے سے گھر سے نکل پڑی اور دیپک کے گھر کی اور چل پڑی تھی۔ ایک منزلہ مکان جو شیام لال بڑی مصیبت اور مشکل سے بنا پائے تھے اُس کے گھر کے پچھواڑے میں ہی تھا۔ اُس نے دیپو کو آنگن میں ایک اونچے بیٹھے ہوئے

پایا۔ وہ اُداس لگتا تھا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دیپو کا چہرہ زرد ہو چلا تھا۔ کرن کی آمد کا اُسے کوئی پتہ نہیں چلا۔ کرن نے آج اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور دھیرے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دیپک کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا لیکن پھر بھی کرن کے ہاتھوں کا لمس پہچان گیا۔ افسردہ سی آواز میں پوچھا تھا اُس نے "کرن"

"تم یہاں کیوں آئی ہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔"

"کوئی نہیں دیکھے گا۔ روز تو آتی ہوں۔ آج کیا بات ہے؟" کرن نے کھلے پن سے جواب دیا تھا۔

"آج دوسری بات ہے کرن" دیپو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

دیپک کے دل کا درد محسوس کر کے کرن کا گلا بھر آیا تھا۔ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"آج نہیں کھیلو گے ہمارے ساتھ" وہ مشکل سے بول پائی تھی۔

دیپک نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ کرن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھا تھا۔

"تم کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا کرن۔ تمہارے پتاجی نے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

"میں کیسے نہ آتی۔ روز روز تو آتی ہوں دیپو" کرن نے سیدھا سا جواب دیا تھا۔

"روز کی بات اور تھی۔ آج میرے باپو نوکری سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہمارا تمہارے گھر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ اب کھیل نہیں سکتی ہو" دیپک نے پُر درد آواز میں کہا تھا۔ کرن کا دل دُکھی ہو اُٹھا۔ وہ تڑپ گئی تھی۔

"نہیں۔ میں روز آؤں گی۔ روز روز جمنا اور تمہارے ساتھ کھیلوں گی" دیپک اُس کا پیار دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اتنی سی لڑکی کے دل میں پیار کا اتنا بڑا ساگر۔ تبھی اُسے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ کل سے خالی پیٹ ہی تھا اُسے لگا اُس کا پیٹ جل رہا ہو۔ بیخودی میں اُس کا ہاتھ پیٹ کی اور چلا گیا اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے خالی پیٹ کو مسلنا شروع کیا۔ ساتھ ہی اُس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہو گئے۔ کرن اس بات کو

محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دھیرے سے اُٹھی اور دیپک سے کچھ کہے بغیر اپنی کوٹھی کی اور چل دی۔ دیپک کے چہرے پر طنز کے آثار آئے۔ وہ مسکرا دیا۔ طنز آمیز مسکراہٹ۔ جیسے کہہ رہا ہو تم بھی اُسی باپ کی بیٹی ہو جس نے ہم سب کو بھوکا رکھنے کی قسم کھائی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی اُسے کرن لوٹتی نظر آئی۔ وہ حیران ہو کر اُسے تکنے لگا۔ کرن کے ہاتھوں میں بڑی سی پڑیا جیسی تھی۔ جونہی وہ قریب آئی اُس نے پڑیا دیپک کی اور بڑھائی تھی۔

"کھاؤ۔ تم بھوکے ہو۔ میں جلدی میں لائی ہوں۔ اِس لئے کم ہے۔ شام کو پھر لاؤں گی"۔ دیپک ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ پچھتانے لگا تھا کہ اُس نے کرن کو فضول میں غلط سمجھا۔ سچ مچ کرن کو اُس کے ساتھ پیار تھا، ہمدردی تھی۔ لیکن اُس کے دل میں طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے تھے۔ وہ سوچنے لگا تھا۔ شاید کرن نے ترس کھا کر بھیک کے طور پر لا کر دیا ہو یا مجھے اور سمجھ کر لائی ہو۔ اِسی خیال سے وہ کرن سے مخاطب ہوا تھا "کرن تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تم نے سوچا میں روٹی کے بغیر جی نہیں سکتا۔ تم بھیک لائی ہو۔ یہ میں نہیں کھا سکتا۔ تم واپس لے جاؤ"۔

کرن اُس کی باتیں سنکر دُکھی ہو اُٹھی۔ اور بلبلا کر رو پڑی تھی۔ دیپک گھبرا گیا۔ کرن نے روتے ہوئے ہی کہا تھا "تم روٹی کے بغیر کیسے جی سکتے ہو۔ جب مجھے بھوک لگتی ہے۔ سب لوں کو بھوک لگتی ہے تو تمہیں بھی ضرور لگتی ہو گی دیپو۔ یہ بھیک نہیں ہے۔ کھاؤ ان کے لئے کھاؤ ورنہ میں شام تک روتی رہوں گی"۔

دیپک کا دل یک دم بھاری ہو گیا۔ اُس نے غلط جانا تھا کرن کے پیار اور خلوص و اصرار پر وہ زیادہ دیر ٹکی نہ رہ سکا۔ بھوک اُسے ستا رہی تھی۔ وہ روٹی کو دو ہی نوالوں میں صاف کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کرن کے ہاتھ سے پڑیا لے لی۔ کھول کر دیکھا گھی کے بنے ہوئے پراٹھے اور حلوہ تھا۔ دیپو نے آج تک ایسا کھانا بہت کم کھایا تھا۔

اِس لئے اُس کے مُنہ میں دیکھتے ہی پانی بھر گیا۔ اُس نے جھپٹ کر نوالہ اُٹھایا اور مُنہ میں ڈالنا چاہا لیکن اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ اُس کے دماغ میں کئی خیال آئے اور گئے۔ کرن حیران ہو کر اُس سے پوچھ بیٹھی۔ "رُک کیوں گئے۔ کھاتے کیوں نہیں"۔

"کیسے کھالوں کرن۔ جمنا بھی تو بھوکی ہے۔ اُسے پہلے کھلاتا ہوں"۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور جیسے ہی اُس نے قدم بڑھانا چاہا۔ اُس کے قدم جم کر رہ گئے۔ جس آدمی کا سامنا اُس نے کیا۔ اُسے دیکھ کر وہ تھرّا اُٹھا تھا۔ رائے صاحب اُسے خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ دفعتًا رائے صاحب نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھوں سے جھپٹ کر وہ پُڑیا چھین لی اور ایک اور پھینک دی۔ ایک ہی جست میں دو تین کتے اُس پر جھپٹ پڑے اور صاف کر گئے۔ دیپک حسرت بھری نظروں سے اُس طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ کرن نے فریاد کی۔ "پتاجی یہ آپ نے کیا کیا۔ وہ بھوکا ہے کل سے بھوکا ہے"۔

رائے صاحب کرن کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے اُسے کچا ہی چبا ڈالنا چاہتے ہوں۔

"تو بھی بھوکی مر جاتی تو اچھا تھا۔ اتنی سی ہو کر میری ناک کٹوانا چاہتی ہے۔ چل تجھے وہیں کوٹھی میں ٹھیک کرتا ہوں"۔ وہ کرن پر برس پڑے تھے اور پھر دیپک کی اور لال انگارہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولے تھے۔ "سُن بے لونڈے۔ آج سے ہماری کوٹھی کے نزدیک بھی آیا تو نوکروں سے پکڑوا کر کھال کھینچ لوں گا"۔ رائے صاحب کرن کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے اور دیپک ـــــ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اندر سے جمنا کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو روٹی کے لئے ترس رہی تھی۔

دیپک کے گھر میں آج بھوک کا دوسرا دن تھا۔ کل سے سبوں نے ایک دانہ بھی نہ کھایا تھا۔ کھاتے بھی کیا۔ گھر میں ایک دانہ بھی موجود نہ تھا۔ جمنا بھوک سے تڑپ تڑپ کر ایک طرف پڑی بیہوش سی تھی۔ دیپک ایک کونے میں پڑا اُداس نظروں سے روتی ہوئی ماں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اور ان سب کا سرپرست اور گھر کا بڑا شیام لال انتہائی بُری حالت میں دربدر نوکری کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ ایک سیٹھ، پھر دوسرے رئیس، تیسری جگہ۔ کئی جگہ وہ نفی میں جواب پا چکا تھا۔ تھک ہار کر وہ پھر ایک سیٹھ کے پاس آکر گڑگڑایا تھا۔

"سیٹھ جی۔ بھگوان کے نام پر مجھ پر دیا کر کے مجھے اپنے پاس نوکر رکھ لیجئے۔ سیٹھ جی میں آپ کے جھوٹے برتن تک صاف کر دوں گا۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔ اُن پر رحم کھائیے۔"
لیکن سیٹھ تو سیٹھ ہوتے ہیں۔ اُن کا کام صرف اپنی تجوریاں بھرنے کا ہے۔ وہ سماج کے ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی فکر اُن کو نہیں کہ کون مرا اور کون جیتا ہے شیام لال کی بات سُنکر سیٹھ نے حقارت سے اُسے دیکھ کر کہا تھا۔ "جاؤ جاؤ راستہ ناپو۔ میرے پاس کیا نوکریوں کا خزانہ ہے۔ جو میں ہر ایک کو بانٹتا پھروں۔" شیام لال ہاتھ جوڑ کر

پھر ایک بار گڑگڑایا تھا۔

"سیٹھ جی میرے گھر والوں پر رحم کھائیے۔ میری معصوم سی بچی بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دیدے گی۔ میرا بچہ مر جائے گا مالک۔ آپ کے بھی تو بچے ہوں گے۔ اُن کے ہی نام پر بھگوان کا واسطہ ہے سیٹھ جی آپ کو اُسی کی خاطر۔ ورنہ آج میرے گھر سے چار لاشیں نکلیں گی۔" کہتے کہتے شیام لال پھر بھرا کر رو پڑا۔ اور اُس نے کسی خیال کے تحت اُس موٹے بدن والے سیٹھ کے پاؤں زور سے پکڑ لئے تھے۔ لیکن موٹے بدن والے سیٹھ کے دل میں شیام لال کے لئے کوئی جذبہ رحم نہیں اُبھرا۔ اُس نے سختی سے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے شیام لال کو دُھتکار دیا تھا۔

"ارے جاؤ جاؤ میرے گھر پر آکر کیوں آنسو بہاتے ہو۔ جاؤ جی۔ راستہ لو۔" اور پھر سیٹھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اور شیام لال وہیں پڑا رہ گیا تھا۔

شیام لال بوجھل قدموں سے اُس بارونق بازار سے گزر رہا تھا۔ اُس کا دماغ پوری طرح ماؤف ہو چکا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کی ٹانگوں میں اب اور چلنے کی سکت نہ رہی ہو۔ کوئی اُسے امید نہیں تھی جس سے کہ اب وہ اپنے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کا پیٹ بھر سکتا۔ وہ خود بھی بھوک سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اپنی بھوک کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اُس کے کانوں میں اپنے بچوں کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اُسے لگا جیسے وہ آوازیں اُس کے دل کو چیر کر رکھ دیں گی۔

”ماں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ روٹی دو نا۔“

”باپو۔ تم روٹی بھی نہیں لا سکتے۔ تم کیسے باپو ہو۔“

”کیا ہم بھوک سے ہی مر جائیں گے۔“

”نہیں نہیں۔ یکایک شیام لال نے زور سے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ اُسے لگا کہ وہ اب اور نہیں چل سکے گا۔ چاروں طرف اُسے جمنا اور دیپک کی روتی ہوئی صورتیں نظر آ رہی تھیں۔

چلتے چلتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔ اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی

کی نئی چمک اُبھر کر آئی تھی۔ وہ اب ریلوے اسٹیشن میں سے گزر رہا تھا اور سامنے ہی بیکڑوں قلی اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کسی کے سر پر ٹوکرا تھا اور کوئی کسی سوٹ بوٹ والے بابو کا سوٹ کیس اُٹھائے جا رہا تھا۔ اچانک ہی اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔ "کسی کا سامان اُٹھا کر کچھ کمایا جا سکتا ہے۔" اِس خیال کے آتے ہی اُس کی نظریں سامنے ہی پڑے سامان کی اور اُٹھ گئیں۔ مگر پھر اُس کا دل جیسے بجھ سا گیا۔ سامان بھاری تھا اور وہ خود کمزور اور ضعیف سا تھا۔ اُس کے بس میں اِتنا سارا بوجھ اُٹھانا نہیں تھا۔ اِسی سوچ میں شیام لال کو پھر اپنے روتے ہوئے بچوں کی فریاد سُنائی دی۔ اور ایک نئے عزم کو لے کر وہ پھر سامان کی اور لپکا تھا۔ اُس کے بازوؤں اور ٹانگوں میں جیسے نئی طاقت عود کر آئی تھی۔ اپنے سامنے پڑے اسٹیل کے ٹرنک کو اُس نے ایسے دبوچ لیا تھا جیسے وہ اُس کی اپنی ہی ملکیت ہو اور کوئی اُس سے چھین لینا چاہتا ہو۔ سامان کے پاس کھڑے ہوئے سوٹ بوٹ والے بابو نے حیران نظروں سے اُس کمزور آدمی کی طرف دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ شیام لال کا دل اُس مسکراہٹ کا طنز محسوس کر کے بجھ سا گیا تھا۔ لیکن اُس نے ہمّت کی اور بابو کی اور التجا بھری آواز سے بولا تھا۔ "میں لے چلوں گا اُٹھا کر۔ بابو صاحب آپ فکر مت کریں۔ میری ٹانگوں میں ابھی دم ہے۔"

"شاید زمانے کے ستائے ہوئے ہو۔ اسی لئے اپنے بدن کو بھول کر اتنے بھاری بوجھ کو لے چلنے پر تُلے ہوئے ہو۔" سوٹ بوٹ والے نے ہمدردی جتلاتے ہوئے شیام لال کی بات کا جواب دیا تھا۔

شیام لال بے بسی سے بابو کو دیکھتا رہا۔ اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی پکڑ اب بھی سامان پر مضبوط تھی۔

"واقعی غربت انسان کو کیا بنا دیتی ہے۔ تم میں ذرا بھی جان نہیں اور اتنا سارا

بوجھ اُٹھانے کو بیتاب ہو رہے ہو۔" بابو کہتا گیا تھا۔

"کیا کروں بابو۔ میں جانتا ہوں میرے بازو کمزور ہیں۔ میری ٹانگوں کا گوشت سُوکھ گیا ہے۔ لیکن میرے اوپر دو بچوں کو پالنے کی ذمہ واری ہے۔ اُن کا پیٹ کیسے بھر سکتا ہوں۔ یہی ایک آخری سہارا ہے بھگوان کے لئے بابو جی۔"

"لیکن تم اتنا بھاری بوجھ نہیں اُٹھا سکتے بھائی۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔" اُس بابو نے پیچھا چھڑانے والے لہجہ میں کہا تھا۔

شیام لال نے ہمت نہ ہاری۔ وہ سامان اُٹھانے کے لئے جھکا۔ اُسے محسوس ہوا کہ سامان بہت بھاری ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسکی ہمت جواب دے گئی لیکن تبھی اُسے اپنے بھوکے بچوں کی روتی ہوئی صورتیں یاد آگئیں اور اُس نے پورا زور صرف کیا۔ اور ممکن تھا کہ وہ سامان اُٹھا لیتا تبھی کئی قُلی شیام لال پر ایسے ٹوٹ پڑے تھے جیسے کسی شکار پر چیل اور کوّے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

"چھوڑیے۔" تو یہ سامان نہیں اُٹھا سکتا ہم رجسٹرڈ قُلی ہیں۔ جا کر پہلے نام درج کرالے فیس بھرلے اور پھر اپنی جان کا دُشمن بن جا۔"

وہ چیختا ہی رہ گیا تھا۔

"نہیں نہیں بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو۔ میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔ یہی تو آخری سہارا ہے۔" لیکن اُس کی کسی نے نہ سُنی اور وہ قُلی سامان اُٹھا کر چلتے بنے۔ "چلو بابو۔ معلوم نہیں کیسے کیسے بھوکے بوڑھے بنا لائسنس کے اندر آجاتے ہیں۔ ارے بھوکا ہے تو مرجا کہیں جا کر۔ روز تو مرجاتے ہیں سیکڑوں۔" سوٹ والے بابو نے آخری نظر شیام لال پر ڈالی اور بڑبڑا کر چلتا بنا تھا۔ شیام لال نے سُنا اُس کے مُنہ سے نکلا تھا "مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

زمین پر پڑے ہی پڑے اُس نے وہ الفاظ غور سے سُنے تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر

مُسکراہٹ اُبھر آئی اور وہ بڑبڑایا تھا۔

"ہمدردی" — ارے دُنیا والوں کو ہر غریب سے ہمدردی ہوتی ہے بابو۔ صرف ہمدردی۔ اور پھر اُس کے مُنہ سے زوردار قہقہہ پھوٹ پڑا تھا۔ اور پھر ہنستے ہنستے ہی اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ اور کئی راہ گیر اُس پر طنز آمیز نظریں ڈال کر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

سُندری ماں نے ایک بار پھر دروازہ کی چوکھٹ سے آکر سر لگا دیا تھا اور باہر دُور تک اپنی ویران نظریں دوڑاتی رہیں۔ وہ کئی بار ایسا کر چکی تھی۔ کچھ دیر وہ سُستانے بیٹھ جاتی اور پھر جونہی جمنا کے مُنہ سے روتی ہوئی کراہ نکلتی وہ جھپٹ کر دروازہ کے پاس چلی آتی اور دُور دور تک نظریں دوڑاتی۔ اِس اُمید پر کہ شاید شیام لال نظر آئے۔ جمنا کی حالت دو دو کر بگڑ چکی تھی۔ آج بھوک کا دوسرا دن تھا۔ اور سب کا پیٹ خالی تھا۔ اُسے اپنی فکر نہیں تھی لیکن جمنا کی روتی ہوئی آواز اُس کا دل چیر کر رکھ دیتی تھی۔ اور۔۔۔

دیپک بیٹھا ویران اور خالی خالی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ اُس کا پیٹ بھی خالی تھا لیکن اپنے سے زیادہ اُسے جمنا کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ جمنا کی کراہیں برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا اور وہ بے قرار سا ہو گیا تھا۔

"تیری وجہ سے یہ سب ہوا۔ نہ تو رمیش سے جھگڑا کرتا نہ ہی باپو نوکری سے الگ کر دیئے جاتے۔ تُو اِن سب باتوں کے لئے ذمہ دار ہے۔ تیری ہی وجہ سے جمنا بھوک سے تڑپ رہی ہے۔ باپو در بدر نوکری کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ میں قصوروار ہوں۔ یہ سب میرے لئے ہی کیا لیکن میں جمنا کو بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔

اُس کا رونا برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ کچھ ضرور کرنا چاہیئے"۔۔۔
تبھی اُس کی نظریں اپنی کتابوں کی اُور اُٹھیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہوئی۔ ایک خیال اُس کے دل میں آیا اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑکی کے راستے سے باہر کودا اور بازار کی اُور تیزی سے بھاگنے لگا تھا۔

شیام لال ہر اُور سے نا اُمید ہو کر تھکے ہوئے بوجھل قدموں سے سڑک پر ایسے چل رہا تھا جیسے کہ اُس کے پاؤں اُٹھ ہی نہ رہے ہوں اور کوئی اُسے گھسیٹ کر لے جا رہا ہو۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ اور دل نا اُمیدی سے بھرا ہوا تھا۔ چاروں اُور اُسے اپنی بدقسمتی کے نظارے دکھائی دے رہے تھے۔ بچوں کی تڑپتی ہوئی آوازیں اور فریادیں سُنائی پڑ رہی تھیں۔ اُسے لگا جیسے اُس نے ہمت ہار لی ہو اور وہ زندگی سے لڑ کر ہار چکا ہو۔ اور اُس کے لئے رہنا اب فضول ہو۔ ایک بار اُس نے اپنے خیالات کو جھٹک دینے کی کوشش کی مگر بے سود۔ چاروں اُور پھر اُسے وہی نظارہ نظر آنے لگتا۔ یکا یک وہ چکرا گیا تھا۔ وہ خود بھی دو دن سے بھوکا تھا۔ اور اُس پر دو دن سے لگاتار گھومتا رہا تھا نوکری کی تلاش میں۔ اِن سب باتوں نے اُسے نڈھال سا کر دیا تھا۔ آخری بار اُس نے اپنے دماغ اور ذہن کو قابو میں کر لیا اور سوچنے لگا کہ کیا اُسے اور جدوجہد کرنی چاہیئے۔ یا زندگی سے ہتھیار ڈالنے چاہیئں۔ اُس نے اُداس دل سے سوال کیا "کیا پھر تلاش کروں"۔

"نوکری کی تلاش فضول ہے"۔ "نوکری کسی بھی صورت میں نہیں مل سکتی"۔ اور اب تھا ایک راستہ مزدوری کرنے کا۔ محنت کر کے کمانے کا۔ وہ بھی تو نہیں کر سکتا"۔—

"شیام لال آج کی اِس دُنیا میں ہر ایک بات کے کچھ اپنے اصول ہیں۔"

"تو نہیں جانتا شیام لال۔ آج کے بھارت کی کیا حالت ہے۔ ارے زیادہ سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی بھی نوکری نہیں پا سکتا تو تجھے کون نوکری دے گا۔ آجکل ڈگریاں کم دیکھی جاتی ہیں۔ آدمی کی قابلیت اور دماغ کا ہمارے سماج میں کوئی درجہ نہیں۔ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ ہمارا دیش ابھی اِن باتوں میں بہت پیچھے ہے۔ چاہیئے تو تھا کہ ہم اُن اچھے دماغوں اور قابلیت رکھنے والوں کی دل و جان سے قدر کرتے۔ اُن کو سر پر جگہ دیتے تا کہ اُن سے کچھ حاصل کرنے کا موقع مل سکتا۔ اُن لوگوں کی ہمّت افزائی کرنے کی بجائے اُن کو ہر جگہ دھتکار دیا جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس نوکری اُن کو ملتی ہے جن کے پاس یا تو کوئی سفارشی خط ہو یا جن کی عرضی کے ساتھ نتھی کی ہوئی روپیوں کی موٹی سی گڈّی ہو۔ چاہے ایسے لوگوں کے پاس عقل اور دماغ نام کی کوئی چیز نہ ہو۔"

شیام لال سوچتا رہا۔ "کیسا ملک ہے۔ کیسا قانون ہے۔ کیسے اُصول ہیں، کیسا سماج ہے۔ کوئی اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا چاہے تو اُس کی بھی اجازت نہیں۔ واہ رے سماج۔ تو نے بھارت کی کیا حالت بنا دی۔ وہ بھارت جو بہت عظیم ہے۔ جس کی ہم جتنی پوجا کریں کم ہے۔ اُسی ملک میں سماج کے بنائے ہوئے ایسے گندے اصول جینے کے کہ بے بس لوگوں پر ظلم ہوتا ہے۔ اتنی ستم پرستی۔ کچھ ہی لوگ ان باتوں کے لئے ذمہ دار ہیں۔ جو لوگ ہمارے سماج کے بڑے ہیں۔ جنھوں نے آج کا سماج بنایا اور جن کے بنائے اصولوں نے ہم سب کو غربت، بھوک، تڑپ، بے کاری کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لعنت ہے ایسے سماج پر۔ سماج وہ ہوتا ہے۔ جو ہماری پرورش کرے۔ روٹی کپڑا مہیا کرے، جو ہم کو تہذیب و تمدّن سکھلائے۔ لیکن یہ کیا تمدّن ہے کہ کئی لوگ اپنے کتّوں کے آگے اتنا کھانا ڈال دیتے ہیں جس سے کہ دو آدمیوں کا پیٹ بھر سکے۔ یہی لوگ ایک طرف کہتے ہیں کہ وہ غربت دُور کریں گے، اور دوسری طرف یہی لوگ اپنی عیاشیوں سے فرصت

نہیں پاتے"

شیام لال کا ذہن پوری طرح ڈوبتا چلا گیا۔ اُسے اپنے ارد گرد کی کوئی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ اور تبھی کسی کار کے بریک زور سے چرمرا گئے اور شیام لال کو زور کا دھکہ لگا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ سڑک پر چکرا کر گر پڑا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے گھبرا کر کھڑکی کھولی اور باہر نکل آیا تھا۔ گاڑی کے اندر کوئی اور شخص موجود تھا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار اُبھر آئے تھے۔

سُندری ماں ایک بار پھر دروازہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اب اُس کے پاؤں بھی درد کرنے لگے تھے۔ جمنا بھوک سے بیہوش ہوتی جا رہی تھی۔ سُندری نے اپنی نظریں دُور دُور تک دوڑائیں۔ اور پھر وہ حیران رہ گئی۔ اُس کی نظریں دیپک پر پڑیں جو دُور سے دوڑتا آرہا تھا اور اُس کے ہاتھ میں کوئی بڑا سا بنڈل تھا۔ ماں اُسے حیران نظروں سے تکنے لگی تھی۔ دیپک نزدیک آکر ٹھٹھک کر رُک گیا تھا۔ وہ ماں سے نظریں ملانے کی تاب نہ لا سکا تھا۔ اچانک سُندری ماں کا اُس کے ہاتھ میں موجود بنڈل پر دھیان گیا اور وہ جھٹ بولی۔ "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ کہاں گئے تھے تم اِس وقت؟"

دیپک کا خیال تھا کہ وہ چوری چوری جمنا کو کھلا دے گا تا کہ ماں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اُس نے کتابیں بیچ کر یہ سب کچھ لایا ہے لیکن اب بھید کھُل چکا تھا اور ماں سے چھپانا بیکار تھا۔ اُس نے ہمت کی اور ماں سے بولا۔

"ماں بازار سے آرہا ہوں۔ جمنا کے لئے پراٹھے لایا ہوں"

سُندری حیران رہ گئی۔ اُس نے آواز میں سختی لاتے ہوئے کہا تھا "لیکن تیرے پاس

پیسے کہاں سے آگئے۔ بول یہ سب کیسے خرید کر لایا تو۔"

"ماں وہ... وہ... ایک لڑکے سے اُدھار لے کر یہ سب لایا ہوں۔ جب ہاتھ میں پیسے آئیں گے۔ اُسے لوٹا دوں گا۔" دیپک نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ لیکن سُندری جانتی تھی۔ وہ اُس پر برس پڑی۔ "اُدھار۔ اور تم کو کوئی دے۔ ارے ابھاگے تم جیسے نردھن کو کون اُدھار دے گا۔ بھلا غریب کا بھی کوئی دوست ہوتا ہے۔ بول تو کونسی چیز چرا کر لے گیا ہے یہاں سے اور لایا ہے یہ سب۔"

دیپک سے برداشت نہ ہوا۔ اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی۔

"ماں۔ تم مجھے چور سمجھتی ہو۔ میں نے کچھ چُرا کر نہیں لیا ماں۔"

سُندری ماں کا ماتھا پہلے سے ہی ٹھنک گیا تھا۔ وہ فوراً اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے وہاں پر سب کچھ اپنی جگہ پر ہی پایا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہی اور پھر اُس کے دماغ میں ایک خیال لپکا۔ اور وہ گلا پھاڑ کر چلّائی تھی۔

"دیپک، یہ تو نے کیا کیا۔" اُس کی آواز بھاری ہو چلی تھی۔

"تو نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری۔ اب کہاں سے تیری کتابیں آئیں گی۔ بول۔ تو برباد ہو گیا دیپو۔" کہتے کہتے ماں بھر بھرا کر رو پڑی تھی۔

"جب پیٹ خالی ہو تو کیسے پڑھا لکھا جائے گا ماں۔ جب جمنا بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاتی تو میرا پڑھنا لکھنا کس کام کا تھا ماں۔" دیپو نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سُندری کے برداشت کا باندھ ٹوٹ گیا اور اُس نے دیپو کو زور سے کلیجے سے لگا لیا۔ اندر سے جمنا کی ہلکی ہلکی کراہیں سُنائی پڑ رہی تھیں۔

گاڑی کے ڈرائیور نے شیام لال پر ایک غلط نگاہ ڈالی اور پھر بُرے بُرے مُنہ بنانے لگا تھا۔ اتنی دیر میں گاڑی کی دوسری کھڑکی کھلی، اور پھر ایک لحیم شحیم آدمی باہر نکلا۔ اُس کے چہرے پر سختی برس رہی تھی۔ آنکھیں کسی خوفناک درندہ کی مانند چمک رہی تھیں۔ اُس کے بال پریشان سے انداز میں لہرا رہے تھے۔ حالانکہ وہ اچھے کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھا پھر بھی وہ نزدیک سے اچھا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ دفعتاً اُس نے شیام لال پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور پھر کسی خیال کے تحت اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ جیسے اُس نے مطلب کی کوئی چیز پالی ہو۔

"ڈرائیور۔ دیکھتے کیا ہو۔ ہوش میں لاؤ اِسے فوراً۔" اُس کا لہجہ ڈراؤنا تھا اور بات کرتے وقت اُس کے جبڑے ایسے پھیل رہے تھے جیسے کسی بڑے اژدھے کا مُنہ چل رہا ہو۔ ڈرائیور نے لپک کر گاڑی میں سے تھرماس نکالا اور اُس میں سے پانی نکال کر شیام لال کے مُنہ پر پانی کی چھینٹیں دینی شروع کیں۔ شیام لال جو صرف گاڑی کے دھکے اور بھوک کی وجہ سے بیہوش ہوا تھا کسمسا کر رہ گیا۔ اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور حیران حیران نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔

"کیوں بے یہ آوارہ گردی کرنے کا مطلب کیا ہے۔ اگر گاڑی کے نیچے آ گئے ہوتے تو"

شیام لال چپ رہا۔

"شاید دُکھی معلوم ہوتے ہو"

شیام لال نے ویران نظروں سے مخاطب کرنے والے کی اُور دیکھا تھا۔ اور پھر مُسکرا پڑا تھا۔ "شکر ہے کہ آپ بھی ہمدردی دکھا رہے ہیں"

مخاطب کرنے والا آدمی مُسکرا پڑا۔ ایک مطلب بھری مُسکراہٹ۔ جس کا مفہوم شیام لال نہ سمجھ سکا تھا۔ اُس پر ایک بھرپور نظر ڈال کر بولا تھا وہ۔

"زمانے کے ستائے ہوئے ہو"

شیام لال کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بھر آئے تھے۔ وہ آدمی نزدیک آیا اور پھر اُس نے شیام لال کی پیٹھ تھپتھپائی اور اُسی سرد سے لہجے میں پھر شیام لال سے مخاطب ہوا۔

"گھبراؤ مت۔ ہم تمہیں نوکری دلا دیں گے۔ اپنے سیٹھ صاحب بڑے دیالو ہیں۔ تم کو روٹی، کپڑا، کھانا پینا اور نقد سب کچھ ملے گا۔ صرف تم کو نوکری ٹھیک طرح سے انجام دینی ہو گی"

شیام لال کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ وہ نا اُمید تو ہو ہی چلا تھا۔ اُسے یقین نہیں آیا اور وہ خوشی سے پاگل ہو کر اُس آدمی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا تھا۔

"بابو صاحب میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ آپ کے برتن بھی صاف کروں گا۔ آپ کے لئے جان دے دوں گا۔ آپ ایک بار آزما کر دیکھ لیں بابو جی"

"بس بس جان دینے کی ضرورت نہیں۔ تم واقعی کام کے آدمی ہو۔ آؤ بیٹھو" شیام لال کو بازو سے تھام کر گاڑی کے اندر بٹھایا تھا اُس آدمی نے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر لی اور تیزی سے ایک طرف ڈرائیو کرنے لگا تھا۔ شیام لال کسی شاندار کار میں آج پہلی بار

بیٹھا تھا۔ اس لئے کچھ سمٹا سمٹا سا بیٹھا رہا۔ اُس شخص نے شیام لال کو غور سے دیکھا پھر بولا۔ "ٹھیک سے بیٹھو۔ پرواہ مت کرو۔ ہمارے سیٹھ اپنے نوکروں کے لئے کار بھی رکھتے ہیں"۔ اور شیام لال اپنے نئے مالک کو اپنے دل میں دیوتا مان کر پوجنے لگا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اُسے اتنی اچھی نوکری ملی ہے۔ اب وہ بچوں کو کھلا سکے گا۔ یہی سوچ کر وہ کسی انجانے سرور میں کھو گیا اور اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی گئیں۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی تھی اور وہ خوفناک قسم کا آدمی شیام لال کی اُور دیکھ کر خوفناک انداز میں مُسکرایا تھا۔

سیٹھ دین دیال اس شہر کے مانے ہوئے امیر تھے۔ وہ سماج کے ایک اعلیٰ رکن تھے۔ غریبوں میں اُن کی عزت اتنی تھی کہ اُن کے لئے ہر ایک جان دینے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ لوگوں میں روٹی کپڑا مفت بانٹتے تھے اور سرکار بھی ان کی عزّت خوب کرتی تھی۔ سیٹھ دین دیال صُوبائی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ اُن بے کسوں کے ترجمان جو روٹی کپڑا اور جگہ کے لئے در بدر بھٹکتے پھرتے رہتے ہیں۔ لوگ جانتے تھے کہ سیٹھ صاحب ہماری آواز یعنی جنتا کی آواز سرکار تک بے دھڑک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لئے اُن کی سارے شہر میں عزّت تھی۔

سیٹھ دین دیال کی ذاتی زندگی سے کوئی واقف نہیں تھا۔ اُن کا ایک ہی لڑکا تھا۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی عمر کا۔ شنکر۔ دین دیال کی بیوی سورگ باش ہو گئی تھیں۔ ان کے شہر میں بہت سے بنگلے تھے لیکن وہ ان دنوں لال کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ لال کوٹھی ایک محل نما کوٹھی تھی جو لال اینٹوں اور لال پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اِسی لئے نام لال کوٹھی رکھا گیا تھا۔ اس کوٹھی میں سیٹھ صاحب کے کچھ مخصوص نوکر ہی رہتے تھے۔ ویسے خود سیٹھ صاحب اکیلے رہنا ہی پسند کرتے تھے۔ سُنا جاتا تھا۔

کچھ سال پہلے اُن کے پاس کئی فیکٹریاں تھیں لیکن پھر وہ بک گئیں۔ آج دین دیال کے پاس کیا تھا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ خوب دان کرتے ہیں۔ لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور۔ بس۔ اور

حقیقت اِس کے برعکس تھی۔ وہ بہت بڑے اسمگلر تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا اڈّہ "گرین کلب" کے نام سے سارے شہر میں مشہور تھا۔ اور اُن کی ایک خفیہ تنظیم بھی تھی۔ وہ شریف بن کر سارے لوگوں کو دھوکہ دے رہے تھے۔ سارے ملک کو دھوکہ دے رہے تھے۔ اور یہی ہیں جو ہمارے ملک کو آگے بڑھانے کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں لیکن وہ ہوتے ہیں دیش کے دشمن۔

اُس وقت سیٹھ صاحب فکر اور بے چینی سے ورانڈے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر غصّے کے آثار تھے اور وہ بار بار باہر گیٹ کی اور نظریں ڈالتے تھے۔ جیسے انھیں کسی کے آنے کا انتظار ہو۔

کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سُنکر سیٹھ صاحب کی نظریں اُٹھیں۔ گیٹ کھول کر ڈرائیور گاڑی اندر تک لایا اور پھر گیراج کے نزدیک ہی گاڑی کے بریک چرمرائے۔ بریک لگنے کی وجہ سے گاڑی ایک دھکے سے رُک گئی اور شیام لال ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دکھ دیں اور اِس بڑی سی لال کوٹھی کی اور گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ دفعتاً دوسرا آدمی گاڑی میں سے نکلا اور ڈرائیور کو کچھ اشارہ کرکے ورانڈے کی اور چل دیا۔ شیام لال ہکّا بکّا رہ گیا تھا۔

وہ آدمی شاندار چال چلتا ہوا ورانڈے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی چڑھنے کے بعد اُس کے پاؤں رُک گئے۔ سیٹھ دین دیال اُس کی اور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اُن کا چہرہ اس وقت کسی بھی طرح شریف نہیں دکھائی پڑتا تھا۔ وہ اپنے غصّے کو پی کر اُس آدمی سے مخاطب ہوئے۔ لہجہ ایسا تھا جیسے کسی خطرناک سانپ کی پھنکار ہو۔

"تم آ گئے۔ لیکن اتنی دیر کیوں؟ تم جانتے ہو راؤ۔ دین دیال وقت کا کتنا پابند ہے۔"

اُس شخص راؤ نے اپنا لہجہ نرم بناتے ہوتے دیر سے آنے کی معافی طلب کی۔

"آدمی مشکل سے ملا ہے باس۔ اسی لئے دیر ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"تم اب سٹھیا گئے ہو راؤ۔ جس بوڑھے کو لا کر تم نے بے وقوفی کی ہے وہ ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔" سیٹھ گرم ہو کر گرجے تھے۔

راؤ مطمئن انداز میں بولا تھا "باس راؤ نے آج تک ہر قدم سوچ کر ہی اٹھایا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اسی بوڑھے سے وہ کام لوں گا۔ اس کو ہینڈل کرنا آسان ہے باس۔ آپ موقعہ تو دیں۔"

سیٹھ صاحب فوراً نرم پڑ گئے تھے۔ راؤ سے نرم لہجہ میں مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہے کام ضرور ہونا چاہیئے۔ ہم تمہیں خوش کر دیں گے۔ جاؤ فضلو کلب میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

راؤ نے ادب سے جھک کر سلام کیا اور مڑتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

دیپک نے ایک بار پھر سُندری ماں کی اور دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ وہ سب شیام لال کی غیر حاضری سے پریشان تھے۔ شیام لال جو دو دن کا بھوکا تھا۔ صبح سے ہی نوکری کی تلاش میں نکلا تھا لیکن ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ سُندری ماں کی بے چین نگاہیں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں مگر شیام لال کا دُور دور تک کوئی نشان تک نہ تھا۔ دیپو اُٹھ کر ماں کے پاس چلا گیا اور پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا تھا۔ "ماں کب تک بابو کا انتظار کریں گے۔ میں اب جا رہا ہوں ماں اُسے ڈھونڈھنے۔ پتہ نہیں بابو اب تک کدھر رہے۔ وہ بھوکے ہیں ماں۔"

سُندری ماں دیپو کی اور صرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اُس نے چاہا کہ وہ دیپو کو روک لے لیکن تب تک دیپو باہر جا چکا تھا۔

دیپک شیام لال کو کئی جگہ ڈھونڈتا پھرا لیکن شیام لال اُسے نہیں ملا۔ اُس نے اُسے بہت تلاش کیا لیکن شیام لال کا پتہ دُور دُور تک نہ تھا۔ وہ بھی تھک ہار کر مایوس سا ہو گیا تھا۔ اُس کے پاؤں تھک سے گئے اور ٹانگیں ملا لرکرنے لگی تھیں۔ وہ نڈھال ہو کر سستانے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں تھکاوٹ کی وجہ سے بوجھل ہو گئیں اور وہ

لمبی لمبی سانسیں لینے لگا تھا۔ اچانک ہی اُس کے سامنے ایک آدمی آ کر کھڑا ہو گیا اور اُسے گھورنے لگا۔ وہ شخص شکل و صورت سے اچھا آدمی نہیں دکھائی پڑتا تھا۔ اُس نے دیپک کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک دیپک کی آمد ہی اُٹھی ہوئی تھیں۔ دیپو کسی سوچ میں مگن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر اس آدمی پر نہ پڑ سکی۔

تھوڑی دیر بعد کسی خیال کے تحت اُس نے سر اُٹھایا اور اُس کی نگاہیں اُس شخص سے چار ہو گئیں۔

"مزدوری کرو گے۔ میرا مطلب ہے تھوڑا سا کام ہے۔ اس کا مطلب مزدوری نہیں۔ تم کچھ پریشان سے لگتے ہو۔ شاید بھوکے بھی ہو۔ ایک معمولی سا کام کرنا ہے۔ تم کرو گے تو ہم تم کو انعام دیں گے۔" وہ شخص نرمی سے بولا تھا۔

دیپک سوچنے لگا تھا۔ بابو مزدوری دیتے ہیں۔ حرج ہی کیا ہے۔ اگر اسی وجہ سے کچھ روپیہ مل جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ گھر میں ماں خوش ہو گی۔" بابو کا کام کرنا چاہیے پھر بابو کو تلاش کروں گا۔"

"کام کیا ہو گا۔ میں کروں گا۔"

"بیٹے۔" وہ شخص جوابا بولا تھا۔ "تم کو ہمارے ساتھ آنا ہو گا۔ کام وہیں بتا دیں گے۔ تم کو انعام ملے گا۔"

"تو میں ضرور آؤں گا۔ چلئے۔ لیکن میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اپنے باپو کو بھی تلاش کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں تھوڑا ہی وقت صرف ہو گا پھر آرام سے باپو کو ڈھونڈھنا تم۔" —— اُس شخص کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہوتی گئی۔ وہ دیپک کا ہاتھ تھام کر چل پڑا تھا۔

گرین کلب۔ شہر کا مشہور ترین کلب تھا۔ رات کا وقت ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سیاہی پھیل چکی تھی۔ شہر روشنیوں کی جگمگاہٹ میں دلہن کی طرح لگ رہا تھا۔ اور گرین کلب بھی اپنی چمک دمک لئے نئے نئے رنگ بکھیر رہا تھا۔ جونہی راؤ شیام لال کو لے کر کلب میں داخل ہوا تھا۔ شیام لال دروازے کے پاس ہی ٹھٹھک کر رک گیا اندر کا نظارہ دیکھ کر اُس کے چہرے پر پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ اندر شراب کی کڑوی بو اور بے حیائی عُروج پر تھی۔ سارے ٹیبل پُر تھے اور شراب کے دور چل رہے تھے۔ بیچ میں ایک ناچنے والی رقاصہ اپنے بدن کی بھرپور نمائش کر رہی تھی۔ شیام لال کا دماغ اُٹھنے لگا اور اُسے اُبکائی سی آنے لگی۔ "ہے پربھو۔ یہ کونسی جگہ ہے مجھے کہاں لایا ہے بابو اتنی گندی جگہ تو میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی"۔

راؤ کی آواز نے شیام لال کو چونکا دیا۔ "رک کیوں گئے شیام لال۔ آؤ آگے بڑھو۔ تمہارے انتظار میں کلب کے سب آدمی بیتاب ہو رہے ہوں گے۔ آگے بڑھو آؤ۔"

"بابو جی آپ مجھے کہاں لائے ہیں۔ میرا یہاں کیا کام ہے"۔ ــــ شیام لال حیران ہو کر راؤ سے بولا تھا ــــ اور راؤ نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

"اس دنیا میں تم کو لایا ہوں شیام لال جس دنیا کو تم جیسے غریبوں سے پوری ہمدردی ہے جس دنیا میں تم جیسے غریب ہی سماج کے ظالم ہاتھوں برباد ہو کر پل رہے ہیں"

شیام لال کو عجیب سا لگا۔ وہ ہچکچا رہا تھا اندر جانے کو۔ راؤ نے اس بات کو محسوس کیا اور شیام لال کے نزدیک جا کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا "یہ وہ جگہ ہے شیام لال جو تیری قسمت بدل دے گی۔ کیا ملا تم کو ٹرکوں پر مانگنے سے۔ کیا ملا تم کو سماج کے ٹھیکیداروں کے پاس جا کر گڑگڑانے سے۔ صرف ٹھوکر شیام لال۔ صرف ٹھوکر اور تم کو اپنے پیٹ کی خاطر۔ اپنے بچوں کی خاطر۔ اسے اپنے جہان کو گلے سے لگا لینا ہے۔ آؤ شیام لال قدم بڑھاؤ اور خود کو ان رنگینیوں میں گم کر دو۔"

شیام لال کے دل میں کئی خیالات آنے لگے تھے ۔۔۔

"باہر جا کر پھر وہی مسئلہ ہوگا۔ وہی روزینہ کا گھورنا۔ وہی ٹھوکر۔ بھوک سے بلبلاتے بچے ہوں گے۔ چاروں اور غربت، بھوک، امیری۔ سماج کے جھوٹے اصول۔ یہی کچھ تو ہوگا"

شیام لال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے قدم بڑھایا تھا۔ انسان کی ہار ہوئی تھی ۔۔ بھوک اور بے بسی کے آگے وہ جھک گیا تھا۔ وہ کپڑے اور روٹی کی خاطر اپنا ایمان بیچ گیا تھا۔ اور ۔۔ شیطان جیت گیا۔ اس نے روٹی اور تن ڈھانپنے کی خاطر غربت کو دور کرنے کے عوض انسان کا ایمان خرید لیا تھا۔

راؤ مسکرایا تھا۔ ایک فاتح مسکراہٹ۔ وہ شیام لال کو لے کر ہال کے آخری سرے تک آیا تھا۔ پھر ایک دروازہ کھول کر راؤ دوسرے کمرے میں داخل ہوا تھا اندر کا نظارہ کچھ دوسرا ہی تھا۔ دس بارہ آدمی جو شکل سے بالکل غنڈے اور بدمعاش لگتے تھے گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور وہ مست ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ راؤ کو سامنے دیکھ کر سب کے چہرے زرد ہو گئے۔

اور سب اُس کی اُور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ راؤ کے چہرے پر غصّے کے آثار ظاہر ہو گئے تھے۔ اُس کے گرجنے پر سب تھرا اُٹھے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگوں سے کتنی بار کہا ہے کہ وقت وقت پر ہی اِس پانی کو پیا کرو۔ کام کے وقت میں نہیں چاہتا کہ تم یہ پی کر اپنی شُدھ بُدھ کھو بیٹھو۔"

یکایک سب لوگوں کے ہاتھوں سے گلاس چھوٹ کر فرش پر گرنے لگے تھے اور دیر تک چھناکے ہوتے رہے تھے۔ شیام لال کو یہ سب عجیب سا لگا تھا لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔

"اگر دوبارہ کسی کو کام کے وقت اِس حالت میں پایا تو اُس کا میں سر پھوڑ دوں گا یاد رکھنا۔"

شیام لال بھی راؤ کے اس سرد سے لہجہ پر دھک سے رہ گیا تھا۔ اور وہ سبھی ہاتھ جوڑ کر راؤ کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔

"بیرو" دفعتاً شیام لال کی اُور دیکھتے ہوئے ہی راؤ نے پکارا تھا۔

"کام ہوا کہ نہیں"۔ راؤ نے سختی سے ہونٹ چبا کر کہا تھا۔

"ہاں اُستاد ـــــ ایک لونڈا ہاتھ آیا ہے ـــــ لیکن بڑا ہی چالاک چھوکرا نکلا اُستاد۔"

"شٹ اپ۔" راؤ گرج کر بولا تھا۔

راؤ صرف کامیابی دیکھنا جانتا ہے ـــــ تم نے ابھی تک اُس کا کوئی علاج نہیں کیا ـــــ خیر جلد اُسے لے کر آؤ" ـــــ وہ جبڑے پھیلا کر گرجا تھا۔

"جو حکم اُستاد" ـــــ بیرو سر جھکا کر بولا ـــــ اور پھر بیرو جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

راؤ نے شیام لال کی اُور بھرپور نگاہ ڈالی —— شیام لال کا دماغ کہیں اور اُلجھا ہوا تھا۔ دفعتاً وہ راؤ کی آواز پر چونک پڑا جو اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھا۔

"اِس کو لے جاؤ۔ نمبر ۱۵ آج سے یہی ہے۔ اِس کو اپنا کمرہ دکھا دو"

اور شیام لال کسی پالتو کتّے کی طرح اُس آدمی کے پیچھے پیچھے چلا گیا تھا۔

بیرو نے اُس لڑکے کو لاکر راؤ کے سامنے کھڑا کیا۔ وہ دیپک تھا۔ ایک بار گی دیپو اور راؤ کی نظریں مل گئیں اور دیپو کو راؤ اچھا آدمی نہیں لگا تھا۔ راؤ نے اُس تیرہ سال کے معصوم لڑکے پر گہری نظریں ڈال کر کہا تھا۔

"لڑکے کیا نام ہے تمہارا؟"

"دیپک۔"

"ہمارا کام کرو گے۔ انعام ملے گا۔" راؤ کا چہرہ نرم تھا۔

"کام کیا ہے۔ جلدی سے بتایئے۔ مجھے جلدی ہے۔"

"معمولی سا کام ہے۔ ہم تجھے ایک ڈبہ دیں گے۔ تجھے یہاں سے ڈبہ لے کر جانا ہوگا۔ سن رائز کلب میں مینیجر کے حوالے کرنا ہوگا۔ تجھے منیجر سے اس کام کے لئے پچاس روپے ملیں گے۔"

"پچاس روپے۔" دیپک اچھل پڑا تھا۔ "اتنے ڈھیر سارے روپے۔"

"ہاں اتنے روپے۔ اِس معمولی سے کام کے لئے۔"

"لیکن ڈبے میں رکھا کیا ہے۔" دیپو کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کسی معمولی ڈبے کے

لیجانے کی مزدوری ہرگز اتنی نہیں مل سکتی۔ ضرور اس ڈبے میں کوئی خاص چیز ہے۔

"لڑکے تم کو اُس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ جواب دو کام کرو گے کہ نہیں"۔

دیپک کا ذہن اتنی بڑی لالچ میں اُلجھ سا گیا تھا۔ لیکن پھر وہ بھی لالچ میں آ ہی گیا۔ گھر کی بُری حالت، بھوک اور غربت اُسے راضی کر گئی تھی۔

"میں کام کروں گا۔ لیکن روپیہ ضرور ملے گا نا"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جونہی تمہارا کام ختم ہوگا تم کو اپنے روپے مل جائیں گے"۔

وہ لوگ دیپک کو ڈبّہ لاکر دے گئے تھے۔ بیرا اُس کو ساتھ لے کر روانہ ہوگیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد داؤ نے پھر کسی کو پکارا تھا۔

"فضلو، جب تک گیارہ نہ بجیں تم نیچے کلب کے ہال میں رہو گے۔ خبردار پولیس کو کچھ بھی شک نہ ہونے پائے۔ جاؤ ان کا پیچھا کرو"۔

شیام لال اُکتایا ہوا سا راؤ کے سامنے رُک گیا تھا۔ اور راؤ اُس کی ادا غور سے دیکھنے لگا تھا۔ شیام لال نے اِس تھوڑی دیر کے اندر اندر اِس نئی دنیا کے متعلق بہت کچھ سوچا تھا۔ اگرچہ وہ اپنا ایمان بیچ کر اس دُنیا میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی آتما زندہ تھی۔ اُس کے دل میں وہی جذبہ تھا۔ وہی تمنا تھی، وہی پیار تھا۔

دفعتاً راؤ نے نرم لہجہ کرتے ہوئے شیام لال سے پوچھا تھا۔

" اب تمہارے کام کا وقت آیا ہے شیام لال۔ اور اِسی گھڑی پر تمہاری آئندہ ترقی کا دار و مدار ہے۔ تم بخوبی اِس کام کو انجام میں لاؤ گے تو تم کو سیٹھ صاحب خوش کر دیں گے "۔ راؤ نے ایک لمحہ کے لئے مُنہ بند کر لیا اور پھر بھاری آواز میں شیام لال کو گھور کر بولا تھا۔

"جانتے ہو تم اب کہاں پر کھڑے ہو"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بابو جی۔ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور آپ کی سیوا کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں"

تبھی راؤ نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔ اور کمرے کی چہل قدمی کرتے کرتے

اچانک شیام لال کی اُور مڑا تھا اور خوفناک مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بول پڑا تھا۔
"شیام لال تم ایک بھولے اور سیدھے سے آدمی ہو۔ جہاں پر تم اِس وقت بڑے مزے سے کھڑے ہو۔ وہ جگہ بدمعاشوں کا ایک بدنام ترین اڈہ ہے۔ یہاں سے سونے، افیم، چرس اور گانجے کی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ یہ سب آدمی میرے زرخرید غلام ہیں۔ میں جس طرح چاہوں ان سے کام لیتا ہوں۔ اور اب۔ اب تم بھی ان ہی جیسے ایک فرد ہو۔"
شیام لال کے پورے وجود میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ اُس کے سارے وجود میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو چلا تھا۔
"نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں بُرا آدمی نہیں بن سکتا۔ آج تک میرے ہاتھوں کوئی پاپ نہیں ہوا۔ میں اتنا نیچ کام نہیں کر سکتا بابو۔ مجھے جانے دو، اپنے ہی حال پر چھوڑ دو۔ میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔"
راؤ کے مُنہ سے کئی زبردست قہقہے پھوٹ پڑے تھے۔ اُس کے جبڑے ایسے ہل رہے تھے جیسے کوئی بڑا سا شیر اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہو۔ آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی تھی۔
"شیام لال ایک بار، صرف ایک بار جو اِس جگہ داخل ہوتا ہے۔ واپس نہیں جا پاتا۔ اور میرے اِشاروں پر چلتے چلتے ہی وہ زندگی کے کئی لمحے گزار دیتا ہے۔ تم جاؤ گے۔ ہم سے دھوکہ کرو گے۔ تم ہم سب کے لئے اب خطرہ بن جاؤ گے۔ لیکن، شیام لال یاد رکھو۔ ہم تم کو جینے نہیں دیں گے۔ تمہارا گھر خاک بنا دیا جائے گا۔ تمہارے بچوں کو چھریوں سے کاٹا جائے گا اور وہ بھی تمہارے ہی سامنے ـــــ کچھ سمجھے تم بوڑھے۔ راؤ نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔" کہتے کہتے راؤ نے شیام لال کو گریبان سے پکڑا اور خونخوار نظروں سے اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا سرد سے لہجہ میں بولا۔ "جو یہاں ایک بار آتا ہے۔ اُس کی ساری زندگی اِسی جگہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور، تم ـــــ تم کسی بھی صورت میں

یہاں سے نہیں جا سکتے۔" لاؤ نے شیام لال کو زبردست جھٹکا دے کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔
دوسرے ہی لمحہ شیام لال اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر گڑ گڑا یا تھا۔
"تم پربھو کے لئے ایسا مت کرو۔ میرے گھر کو برباد مت کرو۔ میرے معصوم بچوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کو مت مارو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میں عمر بھر تمہاری خدمت کروں گا۔" کہتے کہتے شیام لال پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔
راؤ پھر مسکرایا تھا۔ ایک زہر بھری مسکراہٹ۔
"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے گھر کی رکھوالی کریں گے۔ مان لو کہ اب تم ایک مجرم ہو۔"
شیام لال نے روتے ہوئے گردن اقرار میں ہلا دی تھی۔ اس کا دماغ اس وقت مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اسے چاروں اور اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔
"تم نمبر پندرہ ہو۔" راؤ گرجا تھا۔
"ہاں۔" شیام لال نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا تھا۔
"تم ہم سے دھوکہ نہیں کرو گے۔"
"اب کیسے ایسا ہو سکتا ہے۔ تم لوگوں نے پہلے ہی میرے پر کاٹ دیئے ہیں۔"
"تو سنو۔ تم کو پہلا کام اسی وقت کرنا ہو گا۔ تم نے اچھی طرح انجام دیا تو تم کو ایڈوانس میں پانچ سو روپیہ دیا جائے گا۔ کیوں؟ کیا تمہارے گھر کے خرچ کے لئے اتنی بڑی رقم کافی نہیں۔ سڑکوں پر ایڑیاں رگڑنے سے تم کو کیا ملتا۔ یہاں ایک ہی کام کے لئے اتنی بڑی رقم مل رہی ہے۔" راؤ طنز سے بولا تھا۔
"کام بتایئے۔" شیام لال تھکے ہوئے لہجہ میں بولا تھا۔
"فضلو تمہیں ہال میں لے جائے گا۔ وہاں تم کو ایک چھوکرا ملے گا۔ اس کے ساتھ سن رائز کلب جاؤ۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک ڈبہ ہو گا۔ وہ جونہی ڈبہ سن رائز کلب میں دے کر واپس کلب سے نکلے گا۔ تم سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے گولی مار دو گے۔"

"نہیں" شیام لال حلق پھاڑ کر چلّایا تھا۔ اور ایک منٹ کے لئے راؤ بھی سنّاٹے میں کھڑا رہ گیا تھا۔

"نہیں، نہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں خونی نہیں بن سکتا۔ یہ ہاتھ کسی کا خون نہیں کر سکتے"۔ شیام لال کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اور وہ غصّے کی شدّت سے لال ہو گیا تھا۔

"شٹ اپ یو اولڈ مین" راؤ گرج کر شیام لال پر برس پڑا۔ "راؤ نے آج تک کبھی ایسا نہیں سُنا۔ راؤ صرف کام لینا جانتا ہے"۔

"بابو کسی کی دُنیا لوٹنے کا تمہیں کیا حق ہے۔ جانتے ہو زندگی دینا بھگوان کا کام ہے اور لینے کا حق بھی اُسے ہی حاصل ہے۔ تم اُس لڑکے کی زندگی نہیں مٹا سکتے۔ آخر وہ بھی تو کسی کی آنکھوں کا تارا ہوگا"۔

راؤ سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اُس نے ایک بھرپور طمانچہ شیام لال کے گال پر جڑ دیا اور غضبناک ہوتے ہوتے بولا "بکواس بند کرو۔ تم کو نوکر رکھا گیا ہے۔ نصیحت کرنے کے لئے نہیں۔ اُس چھوکرے سے کام لیکر اُسے کسی بھی صورت میں زندہ چھوڑنا حماقت ہے"۔

"مگر وہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ مجھے وہ کام دیجئے میں کروں گا۔ آخر آپ اُس لڑکے سے ہی کیوں یہ کام لینا چاہتے ہیں"۔ شیام لال راؤ کے سامنے گڑگڑا یا تھا۔

"تم اِن باتوں میں ابھی کچّے ہو" راؤ غرّا کر بولا۔ "ہمارے ہر آدمی پر پولیس کی کڑی نظر ہے۔ اور تم پر بھی پولیس شک کر سکتی ہے۔ اُس چھوکرے پر پولیس کی نگاہ نہیں پڑ سکتی اور ہم اُس ڈبّے میں اسمگل کیا ہوا چار لاکھ کا مال کسی بھی طرح نہیں گنوا سکتے سمجھے تم شیام لال"۔

"لیکن میں اُسے کسی بھی صورت میں نہیں مار سکتا۔ چاہے تم مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالو۔ میرا گھر برباد ہی کیوں نہ کر ڈالو۔ لیکن بابو۔ میں اپنے سُکھ چین کے لئے کسی اور کا سکھ نہیں

ٹوٹ سکتا۔" شیام لال نے کسی اٹل ارادے سے کہا تھا۔

لاڈ کا چہرہ غضبناک ہو گیا تھا۔ شیام لال کے چہرے پر دو تین تھپڑ مارتے ہوئے وہ پھر بولا تھا۔

"بیوقوف بڈھے۔ تم یہ کام نہیں کرو گے۔ تو کوئی اور کرے گا۔ لیکن تم اُس لونڈے کی زندگی کسی بھی طرح نہیں بچا سکتے۔" پھر وہ شیام لال پر ایک نفرت بھری نظر ڈال کر لاڈ چلا گیا تھا۔

بیرو نے پورے گیارہ بجے وہ ڈبّہ دیپک کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ ڈبّہ وزن دار تھا۔
دیپک کے دماغ میں خیالات آنے اور جانے لگے۔ اور اُس نے بیرو سے پوچھ ہی لیا۔
"تم لوگوں نے اِس ڈبّہ میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو بھاری لگتا ہے۔"
بیرو فوراً چوکنّا ہو گیا۔ سختی سے اُس نے جواب دیا تھا۔ "سوال مت کرو لڑکے صرف اپنا کام کرتے جاؤ۔" بیرو کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ دیپک اُس کی آنکھوں میں جھانک کر تھرّا اُٹھا تھا۔ اُس کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اُس نے سوچا "ضرور کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔" لیکن انعام کے خیال نے اُس کا تھکا ہوا ذہن پھر بیدار کر دیا۔
بیرو نے اُسے سن لائنز کلب تک جانے کا راستہ زبانی سمجھایا اور تاکید کر دی۔ "میں تمہارے ہی پیچھے پیچھے آ رہا ہوں خبردار کوئی گڑبڑی تو بُرا ہو گا۔ کام اچھی طرح انجام دینا سمجھے۔"

دیپک نے اقرار میں گردن ہلا دی تھی اور بیرو سے اجازت لے کر کلب کو چل دیا تھا۔ کلب کے ہال میں چاروں طرف شراب کا دور چل رہا تھا اور عریانیت عُروج پر تھی۔ بیرو کی للچائی ہوئی نظریں ہال میں ناچنے والی ڈانسر پر پڑیں اور وہ

ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ یکایک اُسے کچھ خیال آیا اور وہ کاؤنٹر پر جا کر رُک گیا۔ پھر اُس نے جلدی جلدی دو تین پیگ گھونٹ گھونٹ پی لئے اور دوسرے ہی لمحہ وہ بھی ہال سے باہر کی اور لپکا تھا۔۔۔۔ دیپک ابھی ٹرک پر ہی چل رہا تھا۔ بیرو نے چوکنا ہو کر چاروں اور ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر دیپک کا پیچھا کرنے لگا۔ ادھر فضلو ہال کے مین گیٹ پر آکر رُک گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنے پیچھے غور سے دیکھا اور پھر وہ بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ٹرک پر جا پہنچا تھا۔

شیام لال کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا کسی آواز نے اُس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ اُسے لگا جیسے کسی نے اُس بچّے پر گولی چلا دی ہو۔ وہ بچہ جو کسی کی آنکھوں کا تارا ہوگا۔ اُس کے اپنے دیپک کی طرح۔ جو کسی کے بڑھاپے کا اُسرا ہوگا۔ وہ جو ابھی معصوم ہے۔ جس نے زندگی کا تھوڑا سا حصّہ کاٹا ہے اور پوری زندگی اُس کے آگے آگے ہے لیکن رام نے اُسے گولی ماردی ہو اور وہ بچہ "بابو" کہہ کر خون میں لتھ پتھ ٹرک پر گرا ہو ——

—— جانے کیوں شیام لال کو اُس بچّے میں دیپو کی شکل نظر آئی تھی۔

"میرا بھی تو لال ہے۔ دیپو۔ کتنا پیارا ہے وہ مجھے۔ سُندری اُسے کتنا چاہتی ہے۔ اگر اُس لڑکے کی جگہ دیپو ہوتا تو! یکایک شیام لال کو اپنا پیارا لاڈ سے پالا ہوا بیٹا یاد آ گیا۔ اُسے اپنا دیپو خون میں لتھ پتھ دکھائی دیا —— اور اُس نے زور سے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ اپنے چاروں اطراف میں اُسے خون ہی خون نظر آنے لگا تھا۔ اور خون میں بھری ہوئی دیپک کی لاش —— وہ بے قرار ہو گیا۔ اُس کے سارے بدن میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی تھی ——

"نہیں، نہیں اُسے بچانا ہوگا —— میں اُسے ہرگز مرنے نہیں دوں گا۔

چاہیے اس کے لئے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے ــــــ میری اپنی زندگی سے زیادہ اُس کی زندگی بہت قیمتی ہے ــــــ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک جھٹکے سے وہ کھڑا ہوگیا اور باہر بھاگ نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا تھا۔

گھڑی گیارہ بجکر پینتیس منٹ کا وقت دکھا رہی تھی جب دیپک "سن رائز کلب" سے نکلا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں دس دس کے پانچ نوٹ چمک رہے تھے۔ اور اُس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ "آج اتنا سا کام کرنے پر اُسے اتنے سارے روپے مِل گئے۔ ماں تو بہت خوش ہو گی۔ اب بابو کو تلاش کروں گا۔ اُنھیں بھی اب دریدہ پھرنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک یہ روپے ہیں۔ ہم عیش سے کھا پی سکتے ہیں"۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا۔

اب وہ کلب کے بیرونی لان میں سے گذر رہا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک رہے تھے۔

جونہی دیپک گیٹ میں سے گزر کر سڑک پر آنکلا۔ اضطراری طور پر اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ جانے کیوں اُس کے سارے بدن میں کپکپی سی طاری ہو گئی۔ تبھی اُس کے کانوں سے ایک دھماکہ سا ٹکرایا اور ساتھ ہی کوئی اُس کے اوپر ایک دلدوز چیخ مار کر آگرا تھا۔ دیپک کا دماغ کچھ وقت کے لئے کچھ نہ سمجھ سکا تھا اور پھر اُس کے کانوں سے لوگوں کی آوازیں ٹکرائیں "خون، خون، ارے کسی نے بیچارے کو گولی

مار کر ہلاک کر دیا۔"

دیپک دھیرے دھیرے سب کچھ سمجھتا چلا گیا اور پھر وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے اوپر گرے ہوئے شخص پر ایک نظر ڈالی اور پھر وہ ایک دلدوز اور کان پھاڑنے والی چیخ کے ساتھ شیام لال پر گر پڑا تھا۔

"بابو" کا لفظ شیام لال کے ڈوبتے ہوئے ذہن تک بھی پہنچا تھا اور اُس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ دیپک پر نظر پڑتے ہی اُس کے بجھتے ہوئے چہرے پر حیرانگی پھیل گئی تھی۔" دیپک تم۔ میرے لال لیکن کیوں۔ تم نے یہ کام کیوں کر لیا تھا۔ بیٹے یہ تو پاپ تھا۔"

" اس کام کو کرنے کے لئے روپے جو ملے بابو۔ میں نے سوچا تھا گھر میں روٹی پکے گی۔ اور آپ کو در در پھرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ مجھے کیا معلوم تھا بابو یہ پاپ ہے۔" وہ رو رہا تھا۔ زاروقطار رو رہا تھا۔

اردگرد بھیڑ جمع ہوتی جا رہی تھی۔

شیام لال کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ اُس نے اپنی آخری سانسوں کو قابو میں کرتے ہوتے کمزور اور نحیف سی آواز میں دیپک سے کہا تھا۔ " تو نے ہمیشہ سچائی کا دامن تھاما اور ماترِ بھومی کی پوجا کی۔ وچن دو مجھے تم ماترِ بھومی کے لئے اپنی جان تک دیدو گے۔ کیونکہ ـــ کیونکہ میں غلطی پر تھا ـــ ماترِ بھومی ـــ کی خاطر ـــ مرنا ـــ ہی سب سے بڑی سیوا ہے۔ وچن دو۔" اُس نے روتے ہوئے اس معصوم لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور دیپک پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہا تھا۔

" میں جا رہا ہوں دیپک۔ میرے لال۔ مجھے وچن دو۔ تم برائی سے دور رہو گے ـــ تم ہمت ـــ مت ہارنا ـــ میرے بچے ـــ سچائی ہی انسان کی زندگی

ہے۔" وہ کمزور آواز میں بولے جا رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ آنکھوں میں آنسو لئے حیران نظروں سے اُن دونوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ شیام لال کی سانسیں اُکھڑنے لگی تھیں۔ اُس نے دیپک پر ایک گہری نگاہ ڈالی جیسے اُس سے وچن لیکر ہی مرنا چاہتا ہو۔ اور ــــ دیپک۔ اُس کا چہرہ ایکبارگی لال ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

"میں وچن دیتا ہوں باپو۔ بُرائی پر ہمیشہ ٹھوکوں گا اور ماترِ بھومی کے لئے ہی جان دیدوں گا۔"

"بس میرے لال اب چین سے مر سکوں گا۔" شیام لال نے ہچکی سی لی تھی ــــ

"نہیں۔ باپو۔ نہیں۔ ایسا مت بو لئے۔ ہمارا کیا ہوگا۔"

"تو.... تم.... بُزدل نہیں... نہیں ہے دیپو... تو دُن.... دُنیا سے لڑ سکتا ہے.... اچھا دیپک.... میں.... ہے بھگوان۔" شیام لال کی سانسیں اُکھڑنے لگیں تھیں اور اُس نے پھر ایک زوردار ہچکی لی۔

"دی... پو...۔" شیام لال کی دھیمی آواز سُنائی دی تھی۔ ... م... ا... ں اور رجنیا.... کا"... اور پھر اُس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

"باپو" کہہ کر دیپک اپنے پتا کی لاش سے لپٹ گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ اُداس اور بھیگی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔

فضلو کی سانسیں بھاگتے بھاگتے پھولنے لگی تھیں وہ جانے کیوں آج ہانپ رہا تھا۔ زندگی میں فضلو نے ان گنت خون کیے تھے۔ بہتوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا لیکن آج۔ آج نہ جانے کیوں یہ خون کر کے وہ پچھتا رہا تھا۔ اُسے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ آج تک جب کبھی بھی داؤد کے حکم پر فضلو نے کسی کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا تھا۔ وہ کبھی بھی گھبرایا نہ تھا۔ وہ کسی کا خون بے دھڑک کرتا۔ اور بالکل نہ گھبراتا — پھر کلب میں جا کر شراب پیتا رہتا۔ خوب شراب پی جاتا اور پھر چین کی نیند سو جاتا — وہ زندگی میں کسی سے بھی ڈرا نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک اُٹھی تھیں۔ وہ بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگتا تھا جیسے کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہو — اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں۔ یکایک وہ لڑکھڑا گیا۔ اُسے لگا جیسے وہ چکرا کر گر پڑے گا۔ اُس نے فوراً ایک دیوار کا سہارا لیا تھا۔ اُس کی زبان خشک ہو چلی تھی۔ سانسیں اُکھڑنے لگی تھیں۔ اور اُسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ وہ حیران تھا آج اُسے کیا ہو رہا ہے۔ آج تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سوچنے

سوچتے فضلو کو شیام لال کی تڑپتی ہوئی لاش اور دیپک کا اُس لاش سے روتے ہوئے لپٹ جانا یاد آگیا اور وہ جھرجھری لیکر رہ گیا تھا۔ اُس خونی کے دل میں بھی ایک ہلچل سی اُٹھی :۔

"یہ اُس نے کیا کیا ؟ فضلو یہ تو نے کیا کیا"۔ بیٹے کو باپ سے لپٹتے ہوئے خود فضلو نے بھی دیکھا تھا۔ اُس کی آتما کراہ اُٹھی :

"اُس نے ایک بے قصور اور غریب باپ کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے جُدا کیا۔ اُن بچوں کو باپ کے پیار اور سایہ سے محروم کر دیا۔ اب اُن کا کیا ہوگا؟ کون پالے گا اُن معصوم بچوں کو ؟"

"یا اللہ۔ یہ میں نے کیا کیا"۔ یکایک فضلو کے منہ سے نکلا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک اُٹھا تھا۔ اُسے لگا جیسے کہ وہ یکایک بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کے بدن میں دم ہی نہ رہا ہو۔ اُس کا سارا وجود ہی ختم ہو گیا ہو۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھاتا گیا اور پھر وہ وہیں دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آج پہلی بار آنسو ٹپک رہے تھے۔

کرن جب چھپتے چھپاتے دیپک کے گھر میں داخل ہو گئی۔ اُس نے سُندری ماں کو ایک اور روتے ہوئے پایا۔ جمنا رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ اُس پاس کے پڑوسی بھی آکر واپس چلے گئے تھے۔ اور اب شام کی گہری تاریکی چاروں اور پھیل رہی تھی لیکن اُن کے گھر میں اندھیرا تھا۔

دیپک ایک اور بیٹھا سر گھٹنوں میں ڈالے رو رہا تھا۔ اُس کی رو رو کر بُری حالت ہو چکی تھی۔۔۔ کرن کو اُن کی ایسی حالت دیکھ کر خود بھی رونا آیا اور اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے دیپو کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ دیپک نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے سُوجھ گئے تھے۔ چہرہ اُداسی سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ کمزور سا لگتا تھا۔ کرن کو دیکھ کر دیپو کا درد پھر سے تازہ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے تھے۔ ہچکیاں بھرتے ہوئے ہی وہ کرن سے بولا تھا۔

"بابو جی چلے گئے کرن۔ کسی ظالم نے انھیں مار ڈالا۔" کرن اُسے دلاسے دیتی رہی تھی۔ "مت رو دیپو۔ مت رو۔ تم روتے ہو تو مجھے بھی دُکھ ہوتا ہے۔"

"اب کیا ہوگا کرن۔ گھر میں روٹی کیسے آئے گی۔ میں کیسے پڑھ سکوں گا۔"

"تم بزدل نہیں ہو دیپک۔ تم بہادر ہو۔ پھر بھی روتے ہو۔ تم کما کر لاؤ گے۔ ماں اور جمنا کو پالو گے اور خود بھی پڑھو گے۔ ایک دن تم بڑے آدمی بنو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں دیپک۔ ہر پل تمہارے ساتھ ہوں۔"

دیپک کرن کا پیار دیکھ کر مبہوت بنا اُسے دیکھتا رہا تھا۔ اُسے لگا تھا جیسے کہ کرن بھی اُس کے گھر کی ہی ایک فرد ہے۔ اور۔ وہ۔ وہ بہت اچھی ہو۔ بہت ہی پیاری۔"

دیپک کسی انجانے سرور میں کھو گیا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالی تھیں اور ایک نئے عزم کو لے کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

عدالت میں سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ چاروں اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ اپنی اپنی کرسیوں میں جم سے گئے تھے۔ عدالت میں موجود لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ خود جج صاحب بھی دل کو بھاری محسوس کرنے لگے تھے۔ اور دیپک۔ وہ بولے جا رہا تھا ــ بولے جا رہا تھا ــ کسی بیباک لیڈر کی طرح۔ بغیر دم لئے ہوئے۔ ماضی کی یادیں ایک ایک کر کے اُس کے دماغ میں آتی جا رہی تھیں اور وہ عدالت میں اپنی زندگی کے بیتے ہوئے دن بیان کرتا جا رہا تھا ــ

" پھر ہمارے گھر میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ بابوجی کے سورگباش ہونے کے کچھ دن بعد ہی مجھے روٹی اور کپڑا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں سے کام لینا پڑا۔ میں مزدوری کرنے لگا تھا اور ماں۔ وہ اُس کمزور حالت میں بھی گھر گھر جا کر لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کرتی۔ اُن کے کپڑے دھو دیتی اور بھی دیگر کام کرتی تاکہ وہ کما سکے اور مجھے پڑھا سکے۔ میرے دل میں ہر وقت ایک ہی غم رہتا کہ ماں کو اُس حالت میں بھی تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی۔ میں دن بھر اسکول جاتا۔ دل لگا کر

پڑھتا اور صبح شام مزدوری کرتا۔ اس طرح کچھ پیسے بن پاتے تھے۔ ماں گھر کا سارا بوجھ خود اُٹھاتی۔ اُس کی دن رات کی محنت ہی مجھے پڑھانے میں مدد دیتی تھی وہ خون پسینہ ایک کرتی۔ لوگوں کے طعنے سُنتی رہتی۔ دُھتکار اور پھٹکار برداشت کرتی۔ کیونکہ اُسے بس ایک ہی بات کی لگن تھی کہ میں پڑھ سکوں اور اُس کے بڑھاپے کا سہارا بن جاؤں۔ اپنے پتا جی کے اصول اپنا سکوں۔ اُن کو دیا ہوا وچن اب بھی مجھے یاد تھا۔ اور وہ گھڑی بھی جب وہ سڑک پر خون میں لتھ پتھ پڑے ہوتے تھے۔ کئی بار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اپنے بابو کے خون کا بدلہ لوں لیکن تبھی بابو کو دیا ہوا وچن یاد آجاتا۔ بُرائی کو بُرائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آدمی سچائی کا دامن تھام لے تو جیت یقیناً ایک دن اُسی کی ہوتی ہے۔ بُرے کے ساتھ بُرا کرنے سے آدمی خود بُرا بن جاتا ہے۔ یہ باتیں میں جانتا تھا۔ اس لئے اپنے ہی کام میں مگن رہا میں۔ اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میں تھکا ماندا شام کو گھر لوٹتا اور میرے ہاتھ میں کچھ پیسے ہوتے میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور خوشی روم روم میں سما جاتی تھی۔ روز ماں میرا انتظار دروازے پر بیٹھ کر کرتی اور جھٹ مجھے اپنے گلے سے لگا لیتی۔ اور چومتے ہوئے کہتی "دیکھ تو تیری صورت کیسی ہو گئی ہے۔ دن بھر پڑھتے بھی ہو اور صبح شام بھی محنت کرتے رہتے ہو"۔ اتنا کہتے کہتے ماں کی آواز بھر آجاتی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ میں اُس کے گلے لگ کر اُس کے آنسو پونچھ ڈالتا اور پیار سے کہتا "ماں تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ ایسا کیوں ماں!" وہ روتے ہوئے جواب دیدیتی "میرے لال۔ یوں ہی اپنی قسمت پر رونا آرہا ہے۔ ایک دن وہ بھی تھا جب تو ہنستا گاتا اسکول سے آتا تھا اور کتابوں کا بستہ پھینک کر کھیل کود میں مست ہو جاتا تھا لیکن آج تو کتابوں کا بستہ چھوڑ کر مزدوری کرنے۔ بوجھ اُٹھانے جاتا ہے۔

آج تو اپنے جسم پر درد اور تکلیف کے نشان لیکر لوٹتا ہے۔ کاش آج تیرے بابو زندہ ہوتے"۔ اور میں ماں کو تسلّی دے دے کر خاموش کرا دیتا۔

کرن روز چپکے چپکے مجھ سے ملتی۔ پیار سے باتیں کرتی رہتی۔ ماں کا کام بھی کرتی اور جمنا کو بیار سے کام کاج کرنا سکھاتی رہتی۔ تسلّی دیتی رہتی اور ہمیشہ ہنساتی رہتی۔ ہم سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ اور ــــ دن گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ میری عمر بھی بڑھتی گئی ـــــ موسم بدلتے رہے سال گزرتے رہے۔ اور ــــ پھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی میری عمر ۲۱ سال کی ہو گئی اور پھر میں جوان سا لگنے لگا۔ وہ بچہ نہ رہا۔ میری صحت شاندار ہو گئی تھی۔ اسلئے میں کڑیل جوان نظر آتا تھا۔

کرن ــــ وہ تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔ لمبی لمبی سی قد والی لڑکی جو کبھی چھوٹی سی گڑیا سی نظر آتی۔ لیکن اُن دنوں تو میں خود بھی ایک گڈا سا نظر آتا تھا۔ اب کرن کی اور دیکھتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ اُس کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ بہت سُندر لگتی تھی اب وہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گورا گورا رنگ روپ۔ لمبے لمبے کالے گھنے بال۔ چہرے پر معصومیت کا نور۔ وہ بالکل پرستان کی پری نظر آتی ــــ وہ بھی اب مجھ سے نظر ملانے کی تاب نہ لاتی تھی۔ ایک دوسرے کے جسم پر نظر ڈال کر کبھی ہم شرما جاتے اور کبھی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑتے تھے ــــ عمر بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ سُوجھ بوجھ بھی بڑھتی ہے۔

اور پھر ــــ ایک دن کرن کے پتا رائے صاحب اس دنیا سے چل بسے۔ کرن روتی رہ گئی۔ اُس کا ایک ہی رکھوالا اُس کا پتا آج اُسے اکیلا چھوڑ کر چل بسا تھا۔

اُس کا بھائی رمیش جوان ہونے کے ساتھ ہی پورا آوارہ ہو چکا تھا۔ باپ کی زندگی میں ہی اُس نے سارا کاروبار عیش کی نظر کر دیا تھا اُس کے گھر میں کوئی اور

بھی ہے۔ اس بات کی سُدھ بُدھ اُسے بالکل نہ تھی۔ وہ تو شراب کے نشے میں دُھت رہ کر اپنی جوان بہن کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔ لے دے کے ایک بوڑھی بُوا ہی تھی اب جو کرن کی سرپرست تھی اُس گھر میں۔ جو کرن کا دُکھ درد بانٹتی رہتی۔ میں نے کرن کو ہمیشہ ہنسنا سکھایا تھا۔ کیونکہ جب میں بھی اسی دور سے ایک دن گزر رہا تھا تو کرن ہی ایک ایسی تھی جو مجھے خوشی خوشی دُکھ برداشت کرنا سکھا گئی تھی اور اب اُسے میرے پیار کی ضرورت تھی۔ میری ہمدردی کی ضرورت تھی

دن گزرتے رہے ۔۔۔ گزرتے رہے۔

ماں اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ جمنا بھی اب جوان ہو چکی تھی اور میں کالج سے ڈگری بھی حاصل کر چکا تھا۔ ماں کو اسی دن کا انتظار تھا۔ کہ میں پڑھائی پوری کر لوں تو اُس کے ارمان پورے ہوں گے۔ اُسے محنت مزدوری نہیں کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اب اُس میں یہ سب کچھ کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

پھر میں نے نوکری کے لئے کئی جگہ عرضی دیدی مجھے پوری اُمید تھی کہ ڈگری لیکر میرا نوکری لگنا آسان ہے۔ لیکن میرے خیال غلط نکلے۔ جس جس جگہ میں نوکری کیلئے گیا وہاں میرے بغیر بھی سیکڑوں ڈگری والے اسی آس و اُمید پر آئے ہوتے۔ میں در در نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا مگر ہر جگہ دو باتیں پوچھی جاتیں "کسی کی سفارشی چھٹی ہے"۔ "رشوت دے سکتے ہو"۔ اور میرے پاس اِن دونوں میں سے ایک بھی چیز نہ تھی۔ میرے انکار کرنے پر مجھے ہر بار یہی جملہ سُننا پڑتا "ساری ہمارے پاس کوئی جگہ خالی نہیں۔ دوسری جگہ آزما کر دیکھئے"۔ اور دوسری جگہ تو یہی کچھ دیکھنے اور سُننے کو ملتا تھا۔

آدمی جب چاروں اور سے نا اُمید ہو تا ہے تو ہمت اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جب اُس کا پیٹ کچھ دن خالی رہتا ہے تو وہ شیطان کے آگے سجدہ کرنے پر

مجبور رہونا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ آخرکار شیطان کی پناہ میں جانا غلط ہے اور اس کی کبھی جیت نہیں ہوتی ہے۔ مان لیا کچھ وقت کے لئے آدمی کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے لیکن پھر بھی اُسے کبھی نہ کبھی اپنی آتما کی آواز دھتکار دیتی ہے۔ اور شیطان ہار جاتا ہے۔ لیکن ایسے آدمی کو اُس وقت سنبھل پانے کا موقع نہیں مل پاتا۔

ان ہی نا اُمیدوں کا شکار میں بھی ہو چلا۔ کبھی کبھی اتنا تھک جاتا اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ آج کی دنیا میں عزت سے رہنا مشکل ہے۔ سماج کے یہ ظالم ٹھیکیدار عزت کی روٹی نہیں کھانے دینگے۔ اگر سماج یہی چاہتا ہے تو کیوں نہ میں کوئی بُرا کام کرکے اپنا پیٹ پال لوں۔ اور میرا یہ خیال جڑ پکڑنا شروع کرتا لیکن تبھی بابو کی صورت میرے سامنے آتی اور اُن کو دیا ہوا وچن یاد آجاتا۔ میں سوچتا سچ مچ بُرا کام کرنے سے میں بُرا بن جاؤں گا۔ اور بُرا بن کر میں لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔

اسی سوچ میں دن رات بیت جاتے اور نوکری نہیں ملی۔ کملہ مجھے دلاسے دیتی۔ ماں کا دل پھر سے ڈوب گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اُس کی ساری محنت بیکار گئی۔ میں ماں کی ڈھارس باندھتا۔ لیکن دن رات اسی سوچ میں رہتا کہ اب کیا ہوگا؟ نوکری کب ملے گی۔ آخر یہ نوکری اتنی مہنگی کیوں ہو گئی ہے۔ اگر ہم پڑھتے ہیں تو کس لئے۔ کس آس پر۔ سرکار یہ سب باتیں پہلے ہی کیوں نہیں سوچتی کہ بیکاری ـــ بے روزگاری کتنی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک طرف سرکار تعلیم مُفت دیتی ہے دوسری طرف پڑھے لکھے لوگوں کو بیکار رکھتی ہے۔ کیوں؟

آخر کب تک یہ رشوت اور سفارش کا مسئلہ چلتا رہے گا؟ کب ہٹ پائینگے سماج کے یہ گندے اُصول جو بھارت کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ اچھے پڑھے ہوئے لوگوں کا گلا گھونٹ کر! کب یہ فرق ختم ہوگا۔ کب تک مجھ جیسے

غریب بے آسرا لوگ در بدر ٹھوکریں کھائیں گے۔ یہاں پڑھے لکھے ذہین لوگوں کی قدر کیوں نہیں؟

یہی سوچتے سوچتے دن گزرتا اور رات کانٹوں پر ہی سو کر بیت جاتی۔ گھر سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور آگے آگے ایک بڑا بھاری بوجھ تھا کاندھوں پر۔ اور وہ تھی جمنا۔ میری بہن۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی میں نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔ باپو کو دیئے ہوئے وچن اور اپنے اصولوں نے میرے قدم جمائے رکھے۔ میں اپنے اُصولوں کو اپناتا رہا۔ شیطان کے آگے سر جھکانے سے میں نے انکار کر دیا۔ اور نہ ہی میں نے آتم ہتیا ہی کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا زندگی بڑی قیمتی شے ہے۔ بھگوان ہی اسے دیتا بھی ہے اور لیتا بھی۔ آدمی اپنی بے بسی کی وجہ سے مصیبتوں سے گھبرا جائے تو اُس کی زندگی ایک طرح سے بیکار ہو جاتی ہے۔

میری کشمکش جاری رہی۔ زندگی تو خود اپنی جگہ ایک کشمکش ہے اور اسے کسی بھی طرح جاری رکھنا ہے۔ مصیبتوں سے ہنستے ہوئے لڑنا زندگی ہے اور زندگی سے تنگ آ کر ہمت ہارنا بھی موت ہے۔

میں دن بہ دن مصیبتوں سے لڑتا رہا اور ایک دن جیت میری ہوئی۔ مجھے نوکری مل گئی۔ سرکاری نہ سہی پھر بھی اچھی تنخواہ تھی۔ مجھے کرسی کی کوئی تمنا نہ تھی لوگ ڈگری حاصل کرنے کے بعد کرسی ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن وہ کم عقل ہیں۔ انسان کو کرسی سے کھانا اور رہنا نہیں ملتا۔ کوئی بھی ذریعہ کمانے کا ہو۔ بس ایسا ہی ایک ذریعہ مجھے بھی حاصل ہوا۔ میرے ایک ہمسایہ موہن نے مجھے نوکری دلوا کر مجھے خرید لیا۔ وہ جس جگہ نوکر تھا وہیں مجھے بھی نوکر لگوا یا اور پھر میں باقاعدہ "رام موٹر گیراج" میں کام کرنے لگا تھا۔

زندگی نے پھر ایک بار نیا موڑ لیا ــــ

دن خوشی خوشی گزرتے رہے۔ ہم پچھلی ساری مصیبتیں اور غم بھولتے گئے۔ میرے دل میں ایک ہی لگن تھی۔ کہ کسی طرح بھی اپنی ماں اور جمنا کو سُکھی رکھوں اور پھر اپنی ماتر بھومی کی سیوا کر سکوں۔ ماں مجھے دن میں دس بار گلے سے لگاتی۔ جمنا مجھے ہنساتی۔ گُدگداتی اور مجھے ہر طرح سے سُکھ دیتی۔ سب کچھ میں نے ایک دم پا لیا تھا۔

اچھی نوکری۔ ماں اور جمنا کی خوشیاں اور کرن کا پیار۔ میں اتنا سب پا کر اپنے ہی حال میں مست رہنے لگا۔

ایسا کہتے ہوئے دیپک کا چہرہ کسی پُرانی یادداشت سے کِھل اُٹھا تھا جیسے وہ دن یاد کرتے ہوئے اُسے بے حد مسرّت ہو رہی ہو۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ اپنی دُھن میں مگن۔ اور عدالت میں موجود سب لوگ سننے میں مگن تھے۔ اور دیپک دور بہت دور اپنے ماضی کی یادوں میں کھوتا چلا گیا۔ عدالت میں پھر وہی خاموش سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔

دیپک اُس دن گیراج سے نکل کر سڑک پر مڑا ہی تھا کہ اُسے دور سے کرن آتی ہوئی نظر آئی تھی۔ لیکن تبھی اُس کے چہرے پر کڑواہٹ پھیل گئی جبکہ اُس نے ایک اور نوجوان کو کرن کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نوجوان پوشاک سے امیر لگتا تھا۔ اور وہ بے شرمی سے کرن کا پیچھا کر رہا تھا۔

دیپک فوراً دیوار کے عقب میں چھپ گیا تھا۔ کرن اُس کے سامنے سے ہی سڑک پر نکل کر گئی اور اُس کے پیچھے وہی نوجوان تعاقب کرتا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ بے حیائی سے کرن کا پیچھا کر رہا تھا۔

دیپک فوراً دیوار کے پیچھے سے نکل آیا۔ اُس نے دور جاتی ہوئی کرن کو دیکھا جو تیز تیز قدم اُٹھا رہی تھی۔ شاید اُسے بھی اُس نوجوان کے تعاقب کا پتہ چلا تھا اور وہ کچھ کچھ پریشان سی نظر آتی تھی۔ دیپک نے نوجوان کو ٹھیک طرح پہچان لیا تھا۔ وہ کئی بار اس کے گیراج میں موٹر کار ٹھیک کرانے کے لئے آیا تھا۔

وہ نوجوان شہر کا لکھپتی رئیس شنکر لال تھا۔ سیٹھ دین دیال کا اکلوتا بیٹا۔ سیٹھ دین دیال تو چند سال قبل مر چکے تھے۔ اور اب اُن کی ساری جائیداد کا وارث

اُن کا اکلوتا بیٹا شنکر ہی تھا۔ سیٹھ شنکر لال عیّاش آدمی تھا۔ اُس کے دل میں مکّاری اور بد معاشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑا ذلیل آدمی تھا اور اُس کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

دیپک نے دوسرے ہی لمحے چھلانگ لگائی اور سڑک پر جا پہنچا تھا۔ کرن اب بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک تنگ سی گلی میں مُڑ چکی تھی۔ شام کا گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا اور رات اپنی سیاہ چادر سارے شہر پر آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ آمد و رفت بھی کم تھی۔ اور تنگ گلی سُنسان پڑی تھی۔ اس لئے وہاں پہنچ کر شنکر لال یکایک کرن کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کرن کا رنگ فق ہو چلا اور وہ گھبرا سی گئی۔ دور دور تک کسی بھی راہ گیر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شنکر لال مکّاری اور عیّاری سے بھونڈی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"شرم نہیں آتی آپ کو شریف لڑکی کا راستہ روکتے ہوئے"۔ کرن نے غصّے میں آ کر پوچھا تھا اور جواب میں شنکر لال بھرپور قہقہہ لگا بیٹھا تھا۔

"تو کیا حضور کو ہم شریف نہیں لگے"۔ وہ بھدّے سے انداز میں ہنس کر بولا تھا۔ "اجی قسم اُس کی جس نے تمہیں بنایا غصّے میں اور بھی حسین لگتی ہو بھگوان قسم"۔

کرن کا چہرہ غصّے کی شدّت سے لال ہو گیا تھا۔ وہ پھر کر بولی تھی۔

"مجھے جانے دو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تم نے اس طرح راستہ روکنے کی جرأت کیسے کی"۔

"ارے دیر تو تم ہی کر رہی ہو جانِ من۔ آؤ ایک بار گلے سے لگ جاؤ کلیجہ ٹھنڈک پڑ جائے گی تو چلی جانا۔ جانتی ہو میں تمہارے پیچھے کتنے دنوں سے لگا ہوں میری جان ہم تو بہت پہلے تم پر قربان ہو چکے ہیں۔ واہ! کیا حُسن پایا ہے۔ کیا انگارے برساتی ہوئی جوانی!" شنکر بے شرمی سے چھیڑ کر اُسے بولا تھا۔ کرن نے اپنے بازو کو

جھٹکا دیکر چھڑا لیا تھا اور پھر ایک بھرپور طمانچہ شنکر کے گال پر جڑ دیا تھا۔ پھر گرج کر بولی تھی "بدمعاش۔ لوفر۔ کتے، کمینے میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔"

شنکر لال ایک سیکنڈ کے لئے سرد پڑ گیا تھا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی اور وہ اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گلے سے لگاتے ہوئے بولا تھا "بس میری جان۔ ایک بار۔ صرف ایک بار اِن حسین آنکھوں سے تو دیکھو۔ اِن بانہوں میں سمٹ کر آ جاؤ۔ ایک بار اِن حسین ترین ہونٹوں کو چومنے تو دو۔ میں تم کو چاہتا ہوں ڈارلنگ!"

کرن اپنے بچاؤ میں جدوجہد کرتی رہی۔ اُس نے شنکر لال کی چھاتی میں زور سے کاٹا اور اُس کے بازو میں ناخن گڑا دیئے۔ ایک لمحہ کے لئے شنکر کی پکڑ کمزور پڑ گئی۔ لیکن پھر وہ غصے سے پاگل ہو اُٹھا تھا۔ اُس نے غصے میں جھپٹ کر کرن کو پکڑا اور دیوار سے لا پٹکا تھا۔ کرن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک زوردار کراہ اُس کے منہ سے نکلی اور اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور شنکر لال وہ وحشی کتے کی طرح اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ وہ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کے دوران بڑبڑا رہا تھا:

"تم نادان ہو لڑکی۔ میں اِس شہر کا سب سے بڑا امیر آدمی ہوں۔ کروڑوں روپے ہیں میرے پاس۔ تم کو رانی بنا کر رکھوں گا۔" کرن نے اپنی چھاتی پر شنکر لال کا دباؤ محسوس کیا اور وہ ہوش و حواس میں لوٹ آئی۔ پھر کسمسا کر چھوٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ہی شنکر کے بھدے ہونٹ اُس کے نازک ہونٹوں کی اور بڑھنے لگے اور کرن زور سے چلّا اُٹھی تھی:

"بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔" لیکن فوراً شنکر لال نے اُس کا منہ اپنے فولادی ہاتھ سے بند کر دیا اور خوفناک آواز میں بولا تھا "یہاں تمہیں بچانے کے لئے

کون آسکتا ہے لڑکی۔ کوئی بھی شنکر سیٹھ کے راستہ میں رُکاوٹ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میری مانو۔ میری ہو جاؤ رانی۔ میری دُنیا میں آ کر تم کو سب کچھ مل جائے گا رانی۔"

— اور تبھی یکایک شنکر سیٹھ نے ایک کراہ کے ساتھ کرن کو چھوڑا تھا۔ اور کرن جب تک سنبھل پاتے شنکر سیٹھ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ کرن نے دیپک کو دیکھا تو وہ کھل اُٹھی۔ دیپک نے شنکر کے منھ پر پھر ایک گھونسہ دیا اور بسر دسے لہجہ میں اُس سے بولا: "تیری دنیا میں آ کر تو کچھ بھی نہیں ملے گا شنکر سیٹھ۔ ہاں چاندی کے چند سکے ضرور ملیں گے۔"

شنکر سیٹھ لڑکھڑا کر اُٹھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ خونخوار نظروں سے اُسے گھورتا ہوا بولا تھا "تم۔ ذلیل کمینے۔ تم ایک معمولی گیراج میں نوکر۔ تم نے ایک بادشاہ سے ٹکر لینے کی کوشش کی۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔" دیپک کے چہرے پر طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اب یہ بھی کہو شنکر سیٹھ کہ تمہارے ہاتھ میں ہی جنم دینا اور زندگی چھیننا بھی ہے۔ کتنے ظالم اور غرور والے ہوتے ہو تم رئیس لوگ۔"

شنکر سیٹھ غصے کی شدت سے کانپ اُٹھا تھا اور اُس نے جاتے ہوئے دیپک کو دھمکی دی تھی:

"ذلیل چھوکرے۔ میں تیری دنیا تیرا گھر بار تنکے کی طرح بکھیر کر رکھ دوں گا۔ میں تمہیں سسکا سسکا کر مار ڈالوں گا تو نے۔ تو نے اپنی موت کو دعوت دی ہے جو شنکر سیٹھ سے ٹکر لی۔"

جواب میں دیپک صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔ پھر شنکر سیٹھ کے جانے کے بعد جب دیپک اور کرن کی آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ کرن دوڑ کر دیپک کی باہوں میں سمٹ گئی تھی اور سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ دیپک اُس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہا تھا اور کرن کی آنکھیں کسی انجانے سرور سے بند ہوتی گئیں۔

شنکر انتہائی غیظ بھرے عالم میں بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے کورٹ اُتار کر ایک طرف پھینک دیا تھا اور سیدھا الماری کی اور چلا گیا تھا۔ بوتل نکال کر وہ ایک ہی سانس میں ساری بوتل غٹاغٹ پی گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ بار بار دیپک کے طنز بھرے الفاظ اُسے یاد آنے لگتے:

"تیری دنیا میں آکر تو کچھ بھی نہیں ملے گا شنکر سیٹھ۔ ہاں چاندی کے چند سکّے ضرور مل جائیں گے"۔ "چاندی کے چند سکّے ضرور ملیں گے"۔

شنکر سیٹھ کو لگا جیسے اُس کے چاروں اطراف میں دیپک ہی دیپک کھڑے ہوں جو اس پر طنز بھرے الفاظ استعمال کر رہے ہوں۔ اُس نے چند ہی منٹوں میں کئی بوتلیں خالی کر کے رکھ دیں لیکن پھر بھی وہ اندر ہی اندر جلتا رہا۔ اور تبھی راؤ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوا تھا۔ شنکر سیٹھ کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ آئی۔ وہ دھیرے سے شنکر سیٹھ کے نزدیک چلا گیا اور اس کا خالی گلاس بھرنے لگا۔

"سیٹھ۔ آج آپ کچھ زیادہ ہی پی گئے ہیں۔ بات کیا ہے؟" راؤ نے خالی بوتلوں کی اور دیکھ کر پوچھا تھا۔

"راؤ۔ گلاس بھرتے رہو۔ یہ مت پوچھو۔ آج میں اپنے غصے کو سُرخی اور سرور میں گھول دینا چاہتا ہوں۔" شنکر نے سرد سی آہ بھری تھی۔

راؤ دور اندیش تھا۔ اُس نے اس بات کو کُریدنے کی خاطر پوچھ ہی ڈالا تھا۔ "لیکن سیٹھ غصہ کس بات کا۔ کیا کسی غلام سے گستاخی ہو گئی؟"

"نہیں راؤ۔" شنکر نشے میں بڑبڑا اُٹھا۔

"پھر آخر بات کیا ہے۔ غلام سے کہئیے۔ آپ کے غصے کو دور کرنے کی کوشش کرے گا۔" راؤ نے شنکر سیٹھ کو مکھن لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"راؤ۔ تم سیٹھ تاراچند مرحوم کی بیٹی کو جانتے ہو؟"

"سیٹھ۔ اس شہر کا کون سا فرد ہو گا جو اُس حسین لڑکی کو نہ جانتا ہو بھکاری سے لیکر بادشاہ تک سب اُس کی اداؤں پر مرمٹتے ہیں۔"

راؤ بولا تھا۔ "لیکن سیٹھ۔ آپ اُس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں کہیں۔"

"میری بات کا جواب دیتے رہو۔ سوال نہیں۔" شنکر نے اُس کی بات کاٹ دی تھی۔

"آپ غلام پر حکم کرتے رہئیے حضور۔" راؤ انکساری سے بولا تھا۔

"اُس لڑکی کا کسی نوجوان سے تعلق ہے۔ تم جانتے ہو۔" شنکر لال نے راؤ کو حیران کر دیا تھا۔

"زیادہ پی کر آپ آج پہلی بار بہک رہے ہیں سیٹھ۔ بھلا اُس قیامت کا ایک بھکاری سے کیا تعلق۔" راؤ نے قہقہہ لگایا تھا۔

"شٹ اپ راؤ۔ کرن اُس بھکاری سے محبت کرتی ہے۔"

راؤ حیران ہو کر شنکر کو تکنے لگا تھا۔" نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا شنکر سیٹھ۔ یہ ناممکن ہے۔"

" یہ سچ ہے راؤ۔ اور شنکر لال کرن کو کسی بھی طرح حاصل کرنا چاہتا ہے۔" شنکر بولا تھا۔

" میں اُس بھکاری کو موت کی نیند سُلا دوں گا۔" راؤ نے ہونٹ بھینچ کر کہا تھا۔

" وہ بُزدل نہیں ہے راؤ۔ بہادر ہے۔"

" پھر بھی غریب ہے سیٹھ۔ یہ دُنیا بھی عجیب ہے۔ جو بہادر ہیں وہ بھکاری کہلاتے ہیں۔ اور جو بُزدل ہوتے ہیں اُن کی سماج میں عزّت کی جاتی ہے۔"

راؤ نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

" مجھے کرن چاہیئے راؤ۔ اور کچھ نہیں۔"

" راؤ نے اپنی زندگی کا ہر داؤ آپ کے خاندان کے لئے لگایا ہے۔ زندگی آپ کے پتا سیٹھ دین دیال کی خدمت میں گزر گئی۔۔۔ بس ایک داؤ اور سہی۔ پھر کرن آپ کی۔"

" لیکن وہ نوجوان جو رام موٹر گیراج میں کام کرتا ہے۔" شنکر نے پوچھا۔

" راؤ اُس کی زندگی کو موت میں بدل دے گا۔" راؤ نے پھل کاٹنے والی چھری کو اُنگلی پر نچاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

" ٹھیک ہے راؤ مجھے تم سے پوری اُمید ہے۔ یہ کام میرا اچھا پرائیویٹ کام ہو گا۔"

" میں ٹھیک طرح سے سمجھ گیا سیٹھ۔ مگر۔" راؤ ذرا رُک رُک کر بولا تھا۔

" مگر کیا۔ جلدی بولو۔" شنکر نے فوراً کہا تھا۔

"سیٹھ اس کام کا میں کچھ خاص پرائیویٹ معاوضہ لوں گا"۔ راؤ کاروباری لہجہ میں مخاطب ہوا تھا۔ ذرا ٹیڑھا ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ کتنا چاہیئے"۔

"راؤ معمولی چیزوں پر اپنی زندگی کا داؤ نہیں لگایا کرتا سیٹھ"۔

"مجھے معلوم ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آجکل تم کچھ اونچا اونچا سوچنے لگے ہو"۔ شنکر سیٹھ نے تلخی سے کہا تھا۔

"میں کرن کی پوری قیمت آپ سے وصول کروں گا سیٹھ"۔

"اس کے لئے میں سب کچھ لٹا دینے پر تیار ہوں"۔

"تو ہو جائے کچھ ایڈوانس کی بات سیٹھ"۔ راؤ مسکرا کر بولا تھا۔

شنکر سیٹھ نے میز کی دراز کھولی۔ نوٹوں کا بنڈل راؤ کے سامنے پھینک دیا۔

راؤ مسکرایا۔ اور نوٹوں کو اٹھا کر ہوا میں اچھالنے لگا تھا۔

"پانچ ہزار ہیں۔ کام ہونے پر ڈبل دوں گا"۔

"بے فکر رہیئے سیٹھ۔ میں جلدی ہی اس کا فرار حسینہ کو آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا"۔ راؤ بھدی ہنسی ہنس کر بولا تھا۔

اور شنکر سیٹھ نے اطمینان سے راؤ پر نظر ڈال کر گلاس میں بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیل دی۔ اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں کرن کا تصور کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

کرن نے اپنا سر دیپک کے سینہ سے لگا دیا اور دھیرے سے بولی تھی :- "اگر کل تم نہ آتے تو میرا کیا ہوتا دیپک۔"

"کیا ہوتا۔ تم اس شہر کی رانی بن جاتیں۔" دیپو نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

وہ پارک کے ایک علیحدہ گوشے میں اس خوبصورت کیاری میں بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے میں کھوتے ہوئے۔ دیپک کی نظریں دور خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں اور کرن۔ وہ دیپک کی اور پیار بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ دفعتاً دیپو نے خلا میں گھورتے ہوتے ہی کرن سے سوال کیا تھا۔

"جانتی ہو کرن۔ وہ کون تھا؟"

"مجھے ایسے لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوگا کوئی آوارہ بدمعاش۔"

"کرن۔ آج میں سوچ رہا ہوں ماں اور جمنا کو لے کر کسی اور جگہ چلا جاؤں اور سکھ کی زندگی گزاروں۔ اب تو کسی طرح کمانے بھی لگا ہوں۔"

کرن اس کی باتیں سنکر حیران ہو کر اسے تکنے لگی تھی۔

"میں سمجھی نہیں دیپک۔ تم یہ سب کیوں سوچ رہے ہو۔"

"کرن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں سیٹھ سُندر سیٹھ میری دُنیا اجاڑ کر نہ رکھ دے۔ وہ بڑا ذلیل آدمی ہے۔ تم نہیں جانتیں کرن وہ کتنا طاقت والا ہے۔ اُس کی پہنچ دُور دُور تک ہے۔" دیپک کچھ سوچتا ہوا بولا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ اگر وہ امیر ہے تو ہمیں اُس کی امیری سے کیا لینا ہے۔ تم تو بہادر ہو۔ پھر ایسی بُزدلوں جیسی باتیں کیوں سوچتے ہو تم۔" وہ اُس کے اور قریب آ گئی۔ اور دیپک اپنے آپ کو بھول کر۔ ساری دنیا کو بھول کر اُس کے وجود سے اُٹھنے والی مہک میں کھو گیا۔ کچھ وقت کے لئے وہ سب کچھ بھول گیا اور اُسے لگا جیسے کہ دنیا میں اور کچھ بھی تو نہیں ہے سوائے اُس کے اور کرن کے۔ کرن اُس کے جسم کی حرارت سے مست ہوئی جا رہی تھی۔ دونوں کے دل دھڑکتے رہے اور ساری کائنات ان کی پاک اور بے خلوص محبت پر قربان ہو گئی۔۔۔ تھوڑی دیر بعد کرن نے چہرہ اُٹھا کر پھر دیپک سے سوال کیا۔ "کیا سوچنے لگے تم دیپک۔ تم ڈرتے کیوں ہو تم اکیلے نہیں ہو دیپک۔ کرن تمہارے ساتھ ہے۔ بھلا کرن کبھی دیپک سے جُدا ہو سکتی ہے ہر پل ہر گھڑی۔ ہم دونوں ساتھ جئیں گے۔ ساتھ مریں گے۔ ہم دنیا سے بھی ٹکرا سکتے ہیں۔ بہادروں کی طرح۔ بُزدل بن کر جینا بھی زندگی ہے کیا۔"

"نہیں کرن نہیں۔" دیپک بول اُٹھا تھا "تم جو سوچ رہی ہو وہ محض ایک خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔ کرن۔ میں غریب۔ میرے رہنے کو صرف ایک جھونپڑی کا، پہننے کو پورے کپڑے نہیں۔ کھانے کو مشکل سے ملتا ہے۔ بھلا میں تمہیں کیا سُکھ دے سکتا ہوں۔ بتاؤ کرن۔ بتاؤ۔" کہتے کہتے دیپک کی آواز بھرا گئی تھی۔ "میرے پاس تمہارے لئے صرف دُکھ ہیں صرف دُکھ۔ اور ساتھ ساتھ غریبی کی بے بسی پر بہانے کے لئے آنسو۔ اور کچھ نہیں۔ یقین کرو۔ میں نے جنم لینے سے آج تک تم سے محبت کی ہے۔

میں تمہاری زندگی میں دکھ نہیں دیکھ سکتا۔"

اور کرن بھی زور سے چلا اٹھی تھی۔ "بند کرو دیپک۔ یہ سب باتیں۔" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے اور وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ "دیپک۔ مت کہو ایسا۔ مت کہو۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ تم نہیں جانتے۔ جو سکھ مجھے تم سے مل سکتا ہے۔ جو خوشی مجھے تم دے سکتے ہو وہ کسی اور سے نہیں مل سکتی دیپک۔ میں تمہارے دکھوں کو گلے سے لگا کر ہمیشہ تمہاری بن کر رہوں گی۔ ورنہ میری زندگی کا انجام صرف موت ہوگا۔"

"کرن" کہکر دیپک نے اسے زور سے بھینچ کر باہوں میں سمیٹ لیا۔ دونوں ایک دوسرے میں سما گئے تھے جیسے ایک ہی آتما ہو کر رہ گئی ہو۔

کرن جونہی گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کا بھائی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس نے کرن پر ایک گہری نظر ڈال کر پوچھا تھا۔

"کہاں گئی تھی تو اِس وقت؟"

"بھیّا۔ وہ سہیلی میری ہے نا پاروہ۔ اُسی کے یہاں گئی تھی۔" کرن نے جھوٹ بولا:

"چُپ۔ یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ اُس کمینے دیپک سے ملنے گئی تھی۔" رمیش لگ بھگ چلّا پڑا تھا۔ کرن کا چہرہ زرد ہو چلا اور اُس کی نظریں جُھک گئیں تھیں۔ بولتی کیوں نہیں ہو۔ کہ تم اُس بھکاری کے ساتھ پیار کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ کُتّا جو ہمارے جیسے دھرتیوں کا سامان اُٹھا کر دو کوڑی وصول کرتا ہے۔ جس کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے شام کی روٹی نصیب بھی ہو گی کہ نہیں۔" رمیش غصّے میں چلّایا تھا۔

"بھیّا اُسے ذلیل مت کرو۔" کرن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"مر گیا تیرا بھیّا۔ تم کس زبان سے میرا نام لیتی ہو۔ جس وقت پتاجی آخری سانس لے رہے تھے اُنھوں نے تمہیں مجھے سونپ کر وچن لیا تھا کہ میں تم کو پال پوس کر

کسی اچھی جگہ بیاہ دوں لیکن تم کمینی ہو نا۔ اپنی خاندان کی عزت کا خیال تم میں ہے ہی کہاں۔"

"بھیا ایسا مت کہو۔ میں نے ایسا کون سا بُرا کام کیا ہے جو خاندان کی عزت کو خطرہ میں ڈال سکے۔" کرن روتی روتی دی تھی۔

"کتنی ہے کمینی۔" رمیش غرا کر بولا تھا۔ "ایک بھکاری کو اپنا پرنیم بنانے کے خواب دیکھتی ہے۔ کیا یہ بُرا کام نہیں ہے۔ کیا تم اپنے خاندان کو مٹی میں نہیں ملوا رہی ہے۔"

تب کرن کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ چلا کر بولی تھی۔ "تو نے خاندان کی عزت کون سی بڑھائی ہے۔ جو مجھ پر اب الزام رکھ رہا ہے۔" وہ پُردرد لہجے میں بولی تھی۔ "تم نے مجھے کون سا پیار دیا ہے۔ بھگوان کے رحم و کرم پر زندہ ہوں میں ورنہ تم نے تو کب کا اپنے عیش و آرام کی خاطر مجھے مار ڈالا تھا۔"

"کرن۔ کیا بک رہی ہے تو۔" رمیش غصے میں چلایا تھا۔

"تم میرے بڑے بھائی ہو۔ میں نے آج تک تمہیں ہی اپنا سب کچھ سمجھا۔ کیا تم نے آج تک مجھے ایک بھائی کا سا پیار دیا ہے۔ تم نے سارا کاروبار برباد کر ڈالا جو کچھ تھا شراب اور عیش میں ختم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ فاقوں پر بھی نوبت آئی۔ لیکن میں نے کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ صرف ایک لُوا ہی تو ہے۔ جس نے خود بھوکی رہ کر مجھے کھلایا۔ اور پال پوس کر بڑا کیا۔ اور تم نے خاندان کی کون سی عزت بڑھائی ہے۔ آج سارا شہر جانتا ہے کہ تم ایک آوارہ شرابی ہو۔"

کرن اس سے بھی آگے بولتی لیکن تبھی رمیش کا بھرپور تھپڑ اُس کے گال پر پڑا۔ کرن کا دماغ گھوم گیا۔ پھر بھی تبھی لُوا رمیش کے سامنے آ گئی۔ سفید بالوں والی وہ بڑھیا جو فرشتہ تھی۔ جس نے کہ کرن کو اپنا خون دیکر اس قابل بنا دیا تھا۔ اُس نے اس گھر کو

خون سے سینچا تھا۔ کرن اُس کو ماں کی نظر سے دیکھتی تھی۔ بُوا کی آنکھوں میں دُکھ ہی دُکھ تھے۔ وہ رمیش کو گھورتی ہوئی بولی تھی "تمہارے کون سے احسان ہیں اس بیچاری پر جو اُس کو اس طرح مار رہے ہو۔ یہ تمہاری کیا لگتی ہے۔"

"تم کیوں آئی ہو یہاں۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔" رمیش چلّا پڑا۔

بُوا مطمئن انداز میں کھڑی رہی۔ اُسے ذرا بھی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ وہ رمیش کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میرا گھر ہے۔ اِسی گھر میں ساری زندگی گزار دی میں نے۔ دُکھ بھی پائے اور سُکھ بھی دیکھے۔ اس معصوم کو میں نے اپنا خون دیکر اِس قابل بنایا کہ وہ دُنیا کو سمجھ سکے۔ اور تم کہتے ہو کہ میں کون ہوں۔ لعنت ہے تم پر رمیش۔ تم نے اپنے پتا کے نام کو مٹّی میں ملا دیا۔"

"بند کرو یہ سب بکواس۔ میں کچھ بھی سُننا نہیں چاہتا۔"

"لیکن میں تو سُنانے ہی کے لئے آئی ہوں۔ چاہے تم میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دو لیکن میں آج سب کچھ سُنا کر ہی رہوں گی۔ ایک تم ہو رمیش جس سے کہ اپنی بہن تک نہ پالی گئی۔ کون سا سُکھ دیا ہے تم نے اُسے۔" کہتے کہتے بُوا کی آواز بھرّا سی گئی۔ "اپنے پتا جی کی جمع کی ہوئی ساری پونجی تم نے بُرے کاموں میں لُٹا دی۔ اور آج۔ تم ایک آوارہ ہو۔ صرف آوارہ۔ رمیش۔ دوسرا وہ ہے۔ جس کو تم کیا سارا سماج بھکاری کہہ کر پکارتا ہے۔ اُس کی اور غور سے دیکھو رمیش۔ اُس نے اپنے جسم پر کتنے زخم برداشت کئے ہیں کتنے دُکھ سہے ہیں۔ کتنی محنت کی ہے اُس نے۔ اور اپنی ماں اور بہن کو پالا اور پوسا ہے۔ اُس نے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلایا۔ اُن کے دُکھ درد بانٹتے بانٹتے وہ جوان ہو گیا۔ اور تم اُس دیوتا کو ہی ذلیل کہہ کر پُکارتے ہو۔ رمیش۔ وہ پوجنے کے قابل ہے۔ اور تم۔ تم پر تھوکنا بھی بہت بڑا پاپ ہے۔"

تبھی رمیش کا ایک زبردست طمانچہ بوڑھی بُوا کے چہرے پر پڑا۔ وہ چند قدم

لڑکھڑا گئی اور پھر فرش پر دھڑام سے گر پڑی تھی۔ کرن پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اُس کا چہرہ سرخ ہوتا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور پھر وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح رمیش پر ٹوٹ پڑی۔ اُس کے ہاتھ میں پھولدان آ گیا تھا۔ وہ رمیش سے گرج کر بولی تھی "کمینے تم نے اُس کو مارا جس نے تم کو اپنا دودھ پلایا ہے۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے تم کو روٹی کھلائی ہے۔ اور اتنا بڑا کیا۔ تم نے اُس ماں پر ہاتھ اُٹھایا جس نے اِس گھر کے لئے خون بہایا۔ تم پاپی ہو۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔"

"کرن پاگل ہو گئی ہے کیا" لوا نے ہوش میں آتے ہوئے کہا تھا۔

"لوا۔ اب یہ میرا بھائی نہیں رہا۔ اِس نے میری ماں پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اب یہ پرایا ہو گیا۔ میں اِس کو مار ڈالوں گی۔"

رمیش نے کرن کو پھولدان کا نشانہ لیتے ہوئے دیکھا اور چلا پڑا تھا۔

"کرن پاگل مت بنو۔ اگر میرا سر پھٹ گیا تو۔"

"اب تمہارا مر جانا ہی اِس گھر کے لئے اچھا ہے۔ تاکہ تم اس گھر کی عزت مٹی میں نہ ملا سکو۔" کرن نے رمیش پر پھولدان پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ رمیش بچکر بھی چوک گیا اور دوسرے ہی لمحہ ایک زوردار کراہ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ خون کا فوّارہ سا اُس کے سر سے جاری ہو گیا تھا۔

لوا حیران نظروں سے کرن کو تک رہی تھی۔ اور کرن وہ ہوش میں آ کر پھٹی ہوئی نظروں سے فرش پر پڑے اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کسی جذبے کے تحت دوڑ کر رمیش سے لپٹ گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ اُسے چوم رہی تھی۔ اور بڑبڑا رہی تھی۔

"یہ میں نے کیا کیا لوا۔ میں نے کیا کیا" اور لوا۔ اُس نے کرن کے سر پہ ہاتھ

پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"کرن تو نے بہت بُرا کیا بیٹی۔ رمیش نے میرے اوپر ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا۔ میں اُس کی ماں جیسی ہوں۔ اُسے میں نے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ اگر مجھے جان سے بھی مار دیتا تو بھی میں اُف تک نہ کرتی۔"

"بھیا" کرن روتی ہوئی بول اُٹھی تھی "مجھے معاف کر دو۔ میں غصّے میں پاگل ہو اُٹھی تھی۔"

"نہیں کرن نہیں۔ معافی تو مجھے تم سے مانگنی چاہیئے۔ تم مجھے معاف کر دو کرن۔ میں نے تمہیں ہمیشہ دُکھ دیئے ہیں۔" وہ کرن کو لپٹا کر بولا تھا "تم نے مجھے نیند سے جگا دیا میری بہن۔"

پھر وہ بُوا کے پاؤں پکڑ کر بولا تھا "بُوا میں چاہے بُرا ہی سہی لیکن پھر بھی تیرا بیٹا ہی ہوں۔ ایک بار۔ صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں قسم کھاتا ہوں آج سے ہی نئی زندگی شروع کروں گا۔"

بُوا نے رمیش کو ممتا بھری باہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ممتا اُس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی تھی "اگر تم مجھے جان سے بھی مار دو گے بیٹے تو میری ممتا پھر بھی نہیں مٹ سکتی۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔"

اور رمیش کسی چھوٹے بچّے کی طرح رو رو کر بُوا کے پاؤں میں پڑا تھا۔ کرن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ رہی تھی۔

دیپک نے سُندری ماں سے پوچھا تھا۔
"ماں ایک بات کہوں۔"
"ہاں بیٹا کہو۔" سُندری نے دیپک کی اور تمنا بھری نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔
"ماں یہ اپنی جمنا ہے نا۔"
"ہاں ہاں۔ کیا ہو گیا اُسے۔ اچھی بھلی تو ہے۔"
جمنا پردے کی اوٹ میں بیٹھی یہ سب باتیں سُن رہی تھی۔ وہ سامنے آ کر مُنہ پُھلا کر ماں سے شکایت کر بیٹھی۔" ماں۔ بھیّا سوچ رہے ہوں گے میں اچھی بھلی کیوں ہوں۔ ٹھیک ہے بھیّا۔ میں آج سے بیمار رہا کروں گی۔"
"ارے ہٹ۔ تو کہاں سے ٹپک پڑی۔ ہر وقت مذاق کرتی رہتی ہے۔ دیکھو نا ماں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ پھر بھی بچّی بنی پھرتی ہے۔"
"ماں۔ یہ میرے اچھے سے بھیّا ہیں نا۔ اِن کو میں بڑی کیوں لگتی ہوں۔"
"بیٹی۔ تو اب بچّی نہیں رہی۔ اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ بس ایک ہی غم ہے

اب مجھے۔ تمہاری شادی ہو جائے بس۔" سُندری ماں ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی تھی۔

"ارے ماں۔ جب دیکھو میری فکر۔ آخر بھیا کو بھی تو دیکھو۔ کتنے لمبے چوڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی بھی فکر کرو ماں۔" جمنا شرارت سے دیپک کو دیکھ رہی تھی۔

"جا جا تیری گُڑیاں رو رہی ہوں گی۔ پہلے جا کر اُن کو سُلا دے۔ میری فکر ہو رہی ہے۔"

"بھیا میری گُڑیاں تو سو گئیں۔ یہ تو بتاؤ تمہاری گُڑیا کب آئے گی۔"

"ماں۔ دیکھو۔ اب میں اس کو ماروں گا۔ بہت زبان چلاتی ہے۔" دیپک اس کی شرارت سے تنگ آ کر ماں سے شکایت کرنے لگا تھا۔ جمنا نے اسے اور ستاتے ہوئے کہا تھا: "آہا۔ اب تو پہلے میری بھابی ہی آئے گی۔۔۔ ماں تم دیر کیوں کر رہی ہو۔ میں نے تو اپنی بھابی بھی دیکھ رکھی ہے۔"

"کس گُڑیا کو مجھ سے باندھنے کا ارادہ کیا ہے۔ میں بھی تو سُنوں۔" دیپک بھی اب اُس کی شرارت میں حصّہ لینے لگا تھا۔

"بھیا وہ اپنی کرن گُڑیا ہے نا۔ کیسی اچھی لگے گی میری بھابی۔" جمنا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"چل ہٹ۔ بڑی آئی میری شادی کرانے والی۔" لیکن دیپک کا چہرہ کسی انجانی مسرت سے کھل اُٹھا تھا۔ اُس کو جمنا کی وہ بات بڑی اچھی لگی تھی کیونکہ اُس نے دیپک کے دل کی بات کھول کر رکھ دی تھی۔

جمنا دوڑتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھی۔ دیپک نے پھر سُندری ماں سے کہا تھا۔

"ماں میں یہ کہہ رہا تھا کہ جمنا اب سیانی ہو گئی ہے۔ اس کی شادی

کر دینی چاہیئے۔"

"تو اپنی کیوں نہیں سوچتا دیپو۔ تو بھی تو کسی کے پلّے باندھنے کے لائق ہو گیا ہے۔"
ماں نے مُسکرا کر جواب دیا تھا۔

"میری فکر مت کر ماں۔ کسی کو راستے سے اُٹھا کر دکھلوں گا گھر میں۔" دیپک نے کہا تھا۔" لیکن تو جمنا کے بارے میں سوچ۔ اب بڑی ہو گئی ہے۔ گھر میں اور کتنے دن رکھو گی اسے۔ میری مانو تو اس کی شادی کر ہی ڈالو اب۔"

اور سُندری ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھی۔" یہی فکر تو مجھے کھائے جا رہی ہے بیٹے کہ اس کی ڈولی جلدی اُٹھے لیکن دیپک اتنی رقم کہاں سے آئیگی۔"

"ماں تو بھی کیا سوچنے لگی ہے۔ تو اس کی فکر مت کر۔ کچھ رقم تو گھر میں بھی جمع ہو گئی ہے۔ کچھ اپنے مالک سیٹھ جی سے اُدھار لے لوں گا۔ کہہ دوں گا بعد میں ہر ماہ تنخواہ سے کاٹ لیا کریں۔ بس تم کسی سے بات کر کے جمنا کے لئے اچھا سا گھر ڈھونڈھ نکالو۔ جہاں میری ننھی سی بہن زندگی بھر سُکھ سے رہ سکے۔"

"لیکن بیٹا اگر سیٹھ جی نے اُدھار نہ دیا تو۔" سُندری فکر مند سی ہو گئی تھی۔
"ماں مجھے اپنے مالک پر بھروسہ ہے۔ وہ مجھے بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ میں کل ہی جا کر اُن سے بات کروں گا۔ تو بالکل فکر مت کر۔"

رمیش جونہی سیٹھ دین دیال کے بنگلہ میں داخل ہوا تھا۔ نوکر نے اُسے روکتے ہوئے کہا تھا۔

"کون ہو جی۔ کام کیا ہے۔ بس چلے ہی آ رہے ہو۔"

"سیٹھ جی اندر ہیں؟"

"کون سیٹھ جی" اکڑ کر نوکر نے جواب دیا تھا۔

"بھئی سیٹھ دین دیال جی۔ اور کون" رمیش اُکتا کر بولا تھا۔

"نہیں وہ نہیں ہیں۔ وہ تو پرسال لانگ ٹور پر چلے گئے تھے مگر واپس نہیں لوٹے۔ جاؤ جاؤ راستہ ناپو۔ راستہ ناپو" نوکر کچھ سنکی سا تھا۔

رمیش مایوس ہو کر مُڑا تھا لیکن تبھی پیچھے سے کسی کی بارعب آواز نے اُسے پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ٹھہرو" شنکر سیٹھ کی آواز تھی۔

رمیش مُڑ کر شنکر سیٹھ کو غور سے دیکھنے لگا تھا۔ اور شنکر سیٹھ وہ گھور گھور کر رمیش کو اُوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً کسی بات کو یاد کر کے رمیش

چونک پڑا تھا۔ اور پھر اُسے شنکر سیٹھ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔

"آپ۔ کون ہیں آپ" شنکر نے پوچھا تھا۔

"میں رمیش کمار ہوں سیٹھ جی سے ملنا تھا"

"سیٹھ جی اب نہیں ہیں مجھے اُنھیں کا دوسرا روپ سمجھو"

"میں سمجھا نہیں" رمیش نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"اندر آؤ وہیں بات ہوگی" شنکر سیٹھ پلٹ کر واپس اندر چلا گیا تھا اور رمیش اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔

ڈرائنگ روم کو دیکھ کر رمیش بوکھلا گیا تھا۔ وہ چاروں اور حیران نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ اور شنکر سیٹھ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

"اتنا شاندار ڈرائنگ روم" رمیش بڑبڑایا تھا۔

"بیٹھو بیٹھو۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو صرف ڈرائنگ روم ہے۔ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ بولو کیا پیو گے۔ وہسکی، جن، ٹھنڈی بیئر، یا۔ یا کچھ اور" شنکر سیٹھ نے نوکر کو آواز دی تھی۔ رمیش گھبرا گیا تھا۔

"نہیں نہیں آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ میں شراب نہیں پیتا"

شنکر سیٹھ نے اونچا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"اچھا تو پھر بھی کچھ ٹھنڈا گرم۔ کافی۔ سوڈا لیمن"

"جی نہیں شکریہ۔ مجھے بھوک نہیں۔ میں کھا کے آیا ہوں" رمیش انکساری سے بولا۔

"ارے بھئی۔ کون کہتا ہے کہ امیر کو بھوک لگتی ہے۔ بس یونہی مجبوراً کچھ نہ کچھ تو ٹھونسنا ہی پڑتا ہے منہ میں۔ عذر مت کرو۔ میری خاطر ایک جام ہی سہی"

شنکر سیٹھ نے پھر نوکر کو آرڈر دیا تھا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں دیا۔" وہ رمیش سے سوال کر بیٹھا تھا۔

"جی میں مرحوم سیٹھ ناراچند رائے کا بیٹا رمیش کمار رائے۔"

"اوہو۔ آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ آپ تو بالکل اپنے نکلے۔" شنکر سیٹھ کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی اور کرن کا چہرہ اُس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

"لیکن آپ!" اب رمیش نے اُس سے سوال کیا۔

"حیران مت ہوئیے۔ آپ اپنے آنے کا مطلب بیان کیجئے۔" شنکر سیٹھ نے رمیش پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"جی۔ بات یہ ہے کہ میں سیٹھ صاحب سے ہی ملنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن۔"

"ارے بھئی گھبراؤ مت۔ تم مجھے ہی سیٹھ دین دیال سمجھو۔ دراصل بات یہ ہے کہ پتا جی دو سال پہلے سورگباش ہو گئے ہیں۔ لیکن کمال ہے آپ کو ابتک بالکل خبر ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے شنکر لال نے اپنی آواز میں درد پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور رمیش چونک کر شنکر سیٹھ کی اور تکنے لگا تھا۔ اُس کا دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ وہ سیٹھ دین دیال سے کسی اُمید پر ملنے آیا تھا۔ اب سیٹھ دین دیال نہیں تھے۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ اُس کا آنا بیکار ہی گیا تھا۔ دفعتاً وہ شنکر کی آواز پر چونک پڑا تھا۔

"میں شنکر لال ہوں۔ سیٹھ دین دیال کا اکلوتا بیٹا۔ اب تم مجھے بھی اپنی بات بتا سکتے ہو۔ ہچکچاؤ مت۔ مجھے بھی اپنا ہی سمجھو۔"

"جی بات دراصل یہ ہے کہ میرے پتا جی اور سیٹھ دین دیال جی آپس میں گہرے دوست تھے۔ آخری وقت پتا جی نے کہا تھا کہ جب کبھی بھی مدد کی ضرورت پیش آئے۔ سیٹھ صاحب کے پاس چلے جانا۔" رمیش رُک رُک کر بولا تھا۔ اور شنکر کی آنکھوں کی چمک کچھ اور تیز ہو گئی۔

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔ آخر کسی مشکل کے وقت ہی اپنے کام آتے ہیں۔ تو حکم کیجئے کس قسم کی مدد چاہیئے آپ کو۔ کوئی دشمن راستے کی رکاوٹ بن رہا ہے تو اُسے راستہ سے ہٹا دوں۔ کسی کا خون کرنا ہے تو اُسے میٹھی نیند سُلا دوں۔ اور اگر کوئی کاروبار میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ تو اُسے برباد کر ڈالوں۔"

"لیکن۔ وہ کاروبار ہے ہی کہاں سیٹھ جی۔" رمیش غمگین لہجہ میں بولا۔

"کیوں آپ کے پتا جی کا تو بہت بڑا بزنس چل رہا تھا۔"

"سب لُٹ گیا سیٹھ جی۔"

"تو کیا ڈاکہ ڈالا کسی نے۔ لیکن ایسی کوئی خبر سننے میں تو نہیں آئی تھی۔"

"نہیں تو۔" رمیش بولا تھا۔

"پھر کیا آگ کی نذر ہوا تھا۔" شنکر نے پھر پوچھا۔

"ایسا ہوتا تو غم نہیں ہوتا۔ دراصل شنکر بابو۔ میں نے سب کچھ اپنے ہی ہاتھوں سے لُٹا دیا۔ اور اب بڑے سیٹھ جی سے کچھ رقم بطور اُدھار مانگنے آیا تھا۔ تاکہ نئی زندگی شروع کر سکوں۔"

شنکر سیٹھ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

"تو آپ کو بزنس کے لئے پیسہ چاہیئے۔ کتنا دس۔ بیس۔ پچاس ہزار یا ایک لاکھ۔"

"گہرے تالاب میں تیرنا بیوقوفی سمجھتا ہوں شنکر بابو۔ بس کسی طرح سے بھی پھر سے دن گزارنے کی آمدنی ہونی چاہیئے۔"

"فکرمت کرو۔ میں تم کو پھر سے رئیس بنا دوں گا۔ مجھے تم اپنا دوست سمجھو۔ رمیش بابو۔ آپ کو اسی وقت رقم مل جائے گی۔ آئندہ بھی جب ضرورت ہو۔ لے سکتے ہیں آپ۔"

رمیش شنکر سیٹھ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا تھا اور شنکر سیٹھ اُس کی اور

دیکھتا ہوا مُسکرا رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں کرن کا تبسم وجود ناچ رہا تھا اور دماغ کسی خطرناک منصوبے میں لگا ہوا تھا۔

"تو ہو جائے۔ اِسی خوشی میں ایک دور" شنکر بولا تھا۔

"لیکن میں نے شراب چھوڑ دی ہے"

"ہم کو معلوم ہے بھائی۔ لیکن آج کی خوشی میں۔ گھبراؤ مت۔ اِس ایک جام سے تم اور تمہارا اِیرلنس ختم نہیں ہو سکتا" شنکر مکاری سے بولا تھا۔

اور پھر اُن دونوں کے جام ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

کرن نے دیپک کے گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ جمنا دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی تھی۔ اور دیپک حیران نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ دفعتاً وہ اُس کے قریب آکر بولا تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا کرن۔ تمہارے بھیّا نے دیکھ لیا تو وہ تمہارا بُرا حشر کر دے گا"۔

"نہیں دیپک۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بھیّا ایسے نہیں رہے۔ تم اور وہ تو بچپن سے اکٹھے سے کھیلتے آئے ہو"۔ کرن بولی تھی۔

"اور میں اُسے ہمیشہ سے مارتا آیا ہوں۔ دُھتکارتا آیا ہوں۔ کیونکہ وہ ہر دم ماتر بھومی بھارت ماتا کی بے عزتی کرتا تھا۔ اور۔ آج بھی۔ کرن اُس کے دل میں صرف نفرت۔ اور صرف نفرت ہو گی۔ اور وہ بھی صرف میرے لئے۔

"نہیں نہیں اب یہ ممکن نہیں۔ میں وہ نفرت مٹا کر رہوں گی"۔ اور دیپک طنز سے مسکرایا تھا۔

"یہ فرق کی دیوار لوہے اور پتھر کی بنی ہوئی دیوار سے بھی زیادہ مضبوط دیوار ہے۔

غریبی۔ امیری۔ اور اس کے درمیان صدیوں سے ایک دیوار کھڑی کی گئی ہے۔ اور وہ ہے پیسہ۔ اور جب تک میرے پاس وہ چیز نہیں۔ یہ دیوار گر نہیں سکتی کرن۔"

کرن جھنجھلا اُٹھی۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں دیپک مجھے اِن باتوں سے نفرت ہے۔ پیسہ پیسہ پیسہ۔ آخر تم یہی بات ہر وقت کیوں دہراتے رہتے ہو۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"کاش میں اِس قابل ہوتا کہ مجھے یہ بات بار بار نہ کہنی پڑتی۔" دیپک نے کہا تھا۔ "اچھا تم بیٹھ کر جمنا کے ساتھ باتیں کرو۔ تب تک میں سیٹھ جی سے مل کر آتا ہوں۔"

"جمنا کی سگائی ہو رہی ہے اور مجھے خبر تک نہ دی۔" کرن نے شکایت کی۔

"کیوں دیتا خبر تمہیں یہ دکھانے کے لئے کہ ہم غریبوں کی سگائی کس طرح ہوتی ہے۔" دیپک طنز سے بولا تھا۔ "نہیں کرن نہیں۔"

"دیپک" کرن نے بھاری دل سے کہا تھا۔ "میں نے تم سے پیار کیا ہے میری آتما تمہاری ہو چکی ہے۔ اور آتما امیری غریبی کا فرق نہیں دیکھتی۔ میں تمہاری ہوں دیپک اور میرے آخری سانس پر بھی تمہارا ہی نام ہو گا۔"

"کرن" دیپک جذبات میں پاگل ہو اٹھا تھا۔ اُس نے جمنا کے سامنے ہی کرن کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

"راؤ"۔
"حکم کیجئے سیٹھ جی"۔
"تم نے ایڈوانس لے کر میرا کام پورا نہیں کیا"۔
"دھیرے دھیرے ہو جائے گا شنکر سیٹھ"۔
"لیکن اب اِس دل سے ضبط ہونا مشکل ہو گیا ہے راؤ"۔
"صبر ہی جو لطف ہے وہ جلد بازی میں کہاں سیٹھ"۔
"لیکن کیا معلوم تب تک وہ بھکاری کرن کو میری نظروں سے دور نہ لیجائے"۔
شنکر سیٹھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا جام پر جام چڑھائے جا رہا تھا۔ اور راؤ اُس کے گلاس بھرتا جا رہا تھا۔
"میں چاہتا ہوں کہ وہ حسین لڑکی بھی تیری طرح میرے گلاس بھر دے راؤ۔ میں اُس کلی کو چومنے کے لئے بے قرار ہوں راؤ"۔
"میں آج ہی ایک داؤ لگانے والا ہوں سیٹھ۔ دیکھتے ہیں کہ وہ بھکاری

کس طرح میرے جال سے بچ کر نکلنا ہے۔" راؤ نے خوفناک مسکراہٹ چہرہ پر لاتے ہوئے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن کام جلد پورا ہونا جانا چاہیئے۔" شنکر کسی انجانے سرور کو محسوس کر رہا تھا۔ راؤ نے اس کا خالی گلاس پھر دوبارہ سے بھر دیا تھا۔

دیپک جونہی اپنے موٹر گیراج میں داخل ہوا۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا تھا۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے وہ مرمّت کے لئے چھوڑی ہوئی گاڑیوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اُس کا مالک رام داس اکیلا آدمی تھا۔ اُس کے بیوی بچّے دُور کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اور رام داس اِسی گیراج کے ایک حصّے میں رہائش پذیر بھی تھا۔ بڑا شریف اور رحم دل انسان تھا۔ دیپک کی محنت لگن اور ایمانداری کو دیکھ کر وہ ہمیشہ دیپک کی عزّت کرتا تھا اور اُس نے اپنے بیٹے کی نظر سے ہمیشہ دیپک کو دیکھا تھا۔ اُس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا اور ہر دم اُس کے کہنے پہ ہی چلتا۔ گیراج زیادہ بڑا نہ تھا۔ باہر ورکشاپ تھا اور اُس کے اندرونی حصّے میں رام داس خود رہتا تھا۔ دیپک جب اندر کے حصّے میں داخل ہوا اُس کے پاؤں ٹھٹھک کر رُک گئے۔ اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اُس کا دل کسی انجانے جذبے کے تحت دھڑک اُٹھا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں چاروں اور اندھیرے میں پھیلا دیں۔ اُسے سب کچھ پُراسرار لگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ رام داس کے کمرے کے دروازے پہ پہنچ گیا

اور دھیرے دھیرے آواز دینے لگا۔ ”مالک۔ میں دیپک آیا ہوں۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اندر سے کوئی جواب نہ پا کر دیپک پریشان سا ہو اٹھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکا سا دھکّہ دیا اور پھر وہ اندھیرے میں ہی آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔

پولیس چوکی رائے گنج کا ٹیلیفون چیخ اُٹھا تھا۔ انسپکٹر گپتا نے لپک کر ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ میں اُٹھایا اور وقت ضائع کئے بغیر ہی ماؤتھ پیس میں زور زور سے بولنے لگا تھا۔

"جی۔ ہاں ہاں۔ کب ہوا۔ لیکن سنیئے تو۔ آپ نے گولی چلنے کی آواز خود سُنی تھی یا کچھ اور۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کون۔ کوئی نوجوان۔ اچھا اچھا میں آرہا ہوں۔ جی ہاں۔ جی۔ کیا۔ رام گیراج رائے گنج۔ جنرل روڈ۔ ٹھیک ہے لیکن سنیئے۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔ ہیلو۔ ہیلو۔ سُنیئے۔ میں نے کہا۔ آپ کون ہیں۔ کہاں سے بول رہے ہیں؟" لیکن دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ انسپکٹر گپتا کسی سوچ میں پڑ گئے۔ ریسیور ابھی تک اُن کے ہاتھ میں ہی لٹک رہا تھا۔

اُسی لمحہ انسپکٹر گپتا چونک پڑے اور انھوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور پھر زور سے پکار اُٹھے تھے۔

"حوالدار پریم سنگھ" اور دوسرے ہی منٹ پر وہ تیزی سے باہر کی اور بھاگ رہے تھے۔

دیپک اندھیرے میں ہی بڑھتا گیا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار رام داس کو پُکارا۔ "سیٹھ جی۔ کہاں ہیں آپ۔ یہ اندھیرا کیوں ہے۔ بتّی جلائیے مالک۔ میں ہوں دیپک۔" لیکن جواب ندارد۔ پھر دیپک بڑی مشکل سے ٹٹولتا ہوا اندھیرے میں ہی سوئچ تک پہنچ گیا تھا۔ اور ساتھ ہی کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ دیپک نے اپنی نظر چمکنے میں چاروں اور دوڑائیں اور پھر ایک جگہ پر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اُس نے اپنی ویران نظروں سے سامنے فرش پر پڑے ہوئے رام داس کی اور غور سے دیکھا جو کہ خون میں لت پت ایک لاش کی شکل میں پڑا تھا۔ دیپو ایک لمحہ کے لئے بوکھلا گیا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

"نہیں۔ مالک نہیں۔ آپ نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ آپ تو ہر ایک کو بیٹا جیسا ہی مانتے تھے۔ آپ تو دیوتا تھے مالک۔ اب کیا ہو گا۔ میرا کیا ہو گا ہے پربھو۔ میری دنیا کس نے لوٹ لی۔ اب جمنا کا کیا ہو گا۔"

اچانک دیپک کی نگاہ لاش کے پاس پڑے ہوئے پستول پر پڑ گئی۔ اُس کا خون کھول اُٹھا تھا۔ اُس نے فوراً جھپٹ کر پستول اُٹھا لیا اور پھر بڑبڑا کر اُس کے

مُنہ سے نکلا تھا۔

"مالک آپ گھبرائیے مت۔ میں آپ کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا" تبھی اُس کے کانوں میں بھاری جوتوں کے چلنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی جست پر انسپکٹر گپتا نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ دیپک ایک دم گھبرا گیا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو اُس نے فوراً پھینک دیا تھا۔ لیکن انسپکٹر طنز بھری مسکراہٹ سے بولا تھا۔

"اب اِس کی ضرورت نہیں دوست۔ پستول پھینک دینے سے کیا ہوگا۔ یُو آر انڈر اریسٹ" حوالدار پریم سنگھ۔ ہتھکڑی لگا دو"

"مسٹر آپ کو رام داس کے خون کرنے کے جُرم میں گرفتار کیا جاتا ہے"

"نہیں نہیں۔ میں خونی نہیں ہوں۔ بھگوان کی قسم انسپکٹر صاحب میں نے مالک کا خون نہیں کیا" دیپک چلّا کر بولا تھا۔

"تمہارے ہاتھ میں پستول موجود تھا۔ جس سے کہ تم نے رام داس کو گولی مار دی۔ تمہارے بغیر آس پاس کوئی اور موجود نہیں۔ کیا اِس کا مطلب یہ نہیں کہ رام داس کا خون تمہارے ہاتھ سے ہوا!"

"نہیں ہرگز نہیں۔ یہ پستول تو میں نے بعد میں اُٹھایا تھا۔ جب میں یہاں آیا تھا۔ اُس وقت سیٹھ جی کی لاش یہاں موجود تھی"

لیکن انسپکٹر گپتا کوئی بات ماننے کو تیار نہ ہوتے۔ اُس نے حوالدار کو اشارہ کیا۔ حوالدار ہتھکڑی لیکر آگے بڑھ آیا تھا۔ دیپک کے لئے اب ایک ہی راستہ تھا۔ یا خود کو گرفتار کرانا یا ــــ اُس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح لپکا اور پھر بجلی کا لیمپ ایک جھناکے سے ٹوٹ گیا اور کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ دیپک نے لیمپ پر کوئی چیز دے ماری تھی۔ پھر وہ رینگتا ہوا

اندھیرے میں چلنے لگا تھا۔

انسپکٹر گپتا نے فوراً پستول نکال کر للکارا تھا۔ "خبردار بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ گولی چلا دوں گا۔" لیکن وہ وقت، وہ لمحے ویک کے لئے انمول تھے۔ وہ ان باتوں پر سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ وہ بڑھتا گیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ ٹرک پر ایک سمت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پولیس اُس کے پیچھے "پکڑو۔ بھاگنے نہ پائے"۔ چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔

دیپک بہت دور نکل آیا تھا لیکن بھاگتے بھاگتے اُس کی سانس پھولنے لگی تھی اور وہ ہانپ رہا تھا۔ اُس کی زبان خشک ہو رہی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ وہ اب اور نہیں چل سکے گا۔ لیکن ابھی پولیس نظروں سے اوجھل نہیں ہو تی تھی۔

اچانک وہ کسی گاڑی کے ہارن سُنکر اُچھل پڑا۔ اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر آگے آگئے۔ گاڑی کے بریک زور سے چرچرائے۔ پھر دروازہ کھول دیا گیا اور دیپک دھم سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر گر پڑا۔ اور زور زور سے سانس لینے لگا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے پھر سٹارٹ ہوئی تھی۔ ڈرائیور کے چہرہ پر ایک شیطانی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ وہ ۔۔۔ راؤ تھا۔

"پولیس تمہارا پیچھا ابھی تک کر رہی ہے" وہ سرد سے لہجہ میں دیپک سے بولا۔

"آپ نے مجھے اس وقت جیل جانے سے بچا لیا۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا"

"تم خونی ہو۔ مجرم ہو" راؤ غرا کر بول اُٹھا تھا۔

"میں بھگوان کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے سیٹھ رام داس کا خون نہیں کیا۔

یہ انواں کی باپ جیسی عزت کرتا تھا۔ وہ تو دیوتا تھے میرے لئے۔ بھلا میں اُن کو کیسے مار سکتا تھا" دیپک کی بھرائی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"لیکن پولیس تو نہیں مان سکتی۔ وہ تمہیں قاتل قرار دے چکی ہے"

"آپ" دیپک ایکبارگی چونک کر راؤ کو غور سے دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں یہ سب۔ کون ہیں آپ؟"

"میرے لئے یہ سب کچھ جاننا مشکل نہیں لڑکے" راؤ بغیر پیچھے دیکھے ہوئے ہی بولا تھا۔ اور اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی۔

"اب ایک ہی طریقہ ہے۔ جب تک یہ معاملہ ختم نہ ہو جائے۔ تم باہر نہیں جا سکتے"

"لیکن میں گھر بھی اس حالت میں نہیں جا سکتا" دیپک رو دیا تھا۔

"گھبراؤ مت نوجوان۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ وہاں پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا" دیپک ممنون ہوتا ہوا بولا تھا۔

راؤ نے گاڑی کی رفتار تیز سے اور تیز کر دی تھی۔ دیپک نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اُس کا دل یکایک ڈوب گیا تھا۔

راؤ کے کمرہ میں چھپے ہوئے دیپک کے دل میں درد سا اٹھنے لگا۔ اُس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ اٹھی۔ ایک خیال آتا، ایک جاتا۔

—"کل جمنا کی برات آئے گی"۔

—"جمنا کل دُلہن بنے گی اور تو چوروں کی طرح چھپتا پھر رہا ہے"۔

—"تمہاری بہن کی ڈولی کیسے اُٹھے گی"

—"برات آکر بِن دلہن کے لوٹ بھی جائے گی"

"نہیں" دیپک بڑبڑاتا چلا گیا "یہ پچھلے جنم کے کوئی سے پاپ کئے ہیں جس کا پھل بھوگ رہا ہوں"

دیپک کے دل میں دُکھ کی ایک لہر سی اُٹھی تھی۔

—"تم نے کوئی گناہ نہیں کیا"

"تم غریب ہو"— اور غربت خود ایک گناہ ہے"

—"تم نِردوش ہو۔ تم سچائی پر چل رہے ہو۔ تم دیش کے سچے سیوک ہو"

"یہی سب تمہارے گناہ ہیں دیپک— یہی سب باتیں تم کو تباہ و برباد کر کے

رکھ دیں گی۔"

— "تم یہ سب باتیں نیاگ دو۔ بن جاؤ تم بھی شیطان۔ یہ سب چیزیں آج کی دنیا میں نہیں چلتیں دیپک۔ تم بھی کتنے بیوقوف ہو۔ اُٹھاؤ پستول — اور کردو چار خون۔ اُٹھوا دو لوٹو تجوریاں۔ لوٹ لو سُہاگنوں کے سُہاگ۔ مٹادو ماتر بھومی کی عزّت — دیپک پھر تم کو سماج میں عزّت ملے گی۔ تم سماج میں اونچا درجہ پاؤ گے — ورنہ تم تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔" میں وہ سب نہیں کر سکتا۔ میں ماتر بھومی کا نام نہیں مٹا سکتا۔ میں نے باپو کو مرتے وقت وچن دیا ہے۔"

"پھر کیا کرو گے؟ — دیکھ سکو گے جمنا کی برات لوٹتے ہوئے؟ اپنی پیاری سی بہن کو روتے ہوئے دیکھ سکو گے تم۔"

یکایک دیپک کا سارا وجود تھرا اُٹھا تھا۔ "نہیں — نہیں — میں مر جاؤں گا۔ لیکن اپنی معصوم بہن کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔" دیپک کا گلا بھر آیا تھا — "لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں کتنا بے بس ہو چکا ہوں۔ کتنا بے بس۔" کہتے ہوئے دیپک بھر بھرا کر رو پڑا تھا۔

"رونے سے کام نہیں چلے گا دیپک — تم کو بہن کی عزّت، لاج اور خوشیاں بچانے کے لئے گُناہ کا دامن ضرور تھامنا ہو گا — اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

— گُناہ کا دامن تھامنا ہو گا۔" دیپک کو لگا جیسے کہ اس کا دماغ پھٹ کر رہ جائے گا۔

— "بہن کی عزّت۔ لاج بچانے کے لئے۔"

— "شیطان کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں — میں جمنا کی خاطر سب کچھ کر لوں گا — میں بہن کی خوشیاں مٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اُس کے لئے اپنے اُصول — اپنا آدرش مٹا دوں گا"
اُس کی نظر سامنے رکھی ہوئی جوری پر پڑ گئی تھی — وہ فوراً کھڑا ہو کر اُس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔
تجوری کمرے میں رکھی اُسے اپنی اور کھینچتی جا رہی تھی۔

تجوری بغیر تالے کے کھلی پڑی تھی۔

دیپک کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ اُس کے ہاتھ جونہی تجوری کی اندرونی سطح کو چھونے لگے تھے۔ راؤ کا زبردست قہقہہ اُس کے کانوں سے ٹکرایا۔ اور اُس نے بوکھلا کر اپنے ہاتھ کھینچ لئے تھے۔

"آخر کار ڈاکہ ہی ڈالا نا۔ میرے دوست۔ مٹ گیا نا تمہارا سارا جوش اور تمہارے وہ اصول۔ چوم لیا نا گناہ کے دامن کو۔ تم بے بس ہو گئے۔" راؤ طنز سے بولتا چلا گیا تھا۔

"میں مجبور تھا۔" دیپک روسا دیا تھا۔

"ہونہہ۔" راؤ زہر بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا تھا۔ "اس دنیا میں ہر ایک مجبور ہوتا ہے نوجوان۔ تم چاہو تو دو پیسے سکتے ہو۔"

"اگر آپ مجھے کچھ رقم اُدھار دے سکیں تو میں آپ کی غلامی کر کے پائی پائی چُکا دوں گا۔" وہ راؤ کے پاؤں پکڑ کر بولا تھا۔

"مجھے تمہاری غلامی نہیں چاہیئے نوجوان۔ صرف ایک سودا۔"

"سودا" دیپک حیران رہ گیا تھا "کیسا سودا"

"کرن" راؤ نے سرد سے لہجہ میں جواب دیا تھا۔ اور دیپک اچھل پڑا تھا۔ اُس کے دماغ میں کئی خیال آنے جانے لگے تھے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے مسٹر" وہ راؤ کو گھور کر بولا تھا۔

"حیران مت ہو جاؤ لڑکے۔ تم کرن کو بھول جاؤ۔ اُس کے دل میں یہ بات بٹھا دو کہ تم نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی۔ تمہارے اور کرن کے تعلقات ختم ہو جانے چاہئیں۔ بس یہی سودا میں تم سے کرنے والا ہوں"

دیپک کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا تھا۔

"تو کیا تم مجھ سے میرے پیار کا سودا کرنا چاہتے ہو"

"تم مجبور ہو سودا کرنے کے لئے۔ کل تمہاری بہن کی برات آ رہی ہے"

"تم ذلیل ہو۔ کُتے ہو۔ کمینے ہو۔ شیطان ہو۔ اب میں جان گیا کہ تم نے مجھے پولیس کے ہاتھوں بچایا کیوں لیا اور یہاں کیوں پناہ دی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے ہی میرے مالک سیٹھ رام داس کا خون بھی کیا ہے"

راؤ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

"تم بالکل ٹھیک سمجھ گئے ہو۔ بولو اب کیا ارادہ ہے"

"میں کسی معصوم کو اپنی بہن کی خاطر بیچ نہیں سکتا مسٹر۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھو سیٹھ جی کا خون یونہی نہیں جائے گا۔ اُس کا حساب تم کو ضرور دینا ہو گا" دیپک کہتا ہوا باہر کی اور لپکا تھا اور پھر راؤ کے قہقہے اُسے دُور تک سنائی دیتے رہے تھے۔ راؤ کی وہ طنز بھری آواز — "تم پھر لوٹ کر آؤ گے میرے دوست"

دیپک چھپتا چھپاتا دوڑتا جا رہا تھا اور اُس کے ذہن میں شہنائیوں کی گونج سی اُٹھ رہی تھی۔

سُندری نے ایک بار پھر بے چین نگاہوں سے سڑک پر دور دور تک تاکنا شروع کیا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھی۔ اُس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔

جمنا کی شادی ہونی تھی۔ اور برات آئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ دیپک کو کنیادان کرنا تھا اور وہ ابھی تک لاپتہ تھا۔ دُولہا لگن منڈپ میں بیٹھے بیٹھے اب اُکتا کر اُونگھنے لگا تھا۔ سارے براتی آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے تھے۔ اور دُولہے کا باپ لمبی سی پگڑی باندھے غصّے میں لال پیلا ہو رہا تھا۔ کرن آنکھوں میں بے چینی لئے جمنا کو ڈھارس بندھا رہی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں بھی اُلجھن کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ دفعتاً سمدھی نے ایک بار پھر غصّے میں آکر مونچھوں پر تاؤ دیا اور پھر اونچی آواز میں سُندری سے کہنے لگا تھا۔ اجی بس۔ ہو چکی شادی۔ ہم کو بے عزّت کر کے رکھ دیا۔"

"نہیں نہیں لالہ جی۔ ایسا مت بولئے۔ بس دیپک آتا ہی ہو گا۔"

"اجی بس۔ اب کیا آئے گا۔ بس۔ بھلا ایسے آدمیوں کا بھی بھروسہ ہے۔ یہ تو اچھا ہوا جو آیا ہی نہیں۔ کیا معلوم ورنہ بعد میں کیا کیا مصیبت اُٹھانی پڑتی۔"

تبھی دیپک پریشان چہرہ لئے لالہ جی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوتے سے تھے اور چہرے سے اُداسی ٹپک رہی تھی۔

سُندری ماں کی جان میں جان آئی۔ وہ لپک کر دیپک کے پاس پہنچ گئی۔

"دیپک کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے بیٹا۔ تم رات بھر کہاں رہے۔ تمہارا چہرہ پریشان سا کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ سب ٹھیک ہے نا بیٹے؟" سُندری ماں ایک ہی سانس میں کہہ گئی تھی اور اُس کا دل دھڑک اُٹھا تھا۔ دیپک کو ایک طرف لیجا کر اُس نے پریشان سے لہجہ میں پوچھا تھا "روپے کا انتظام تو ہو گیا نہ بیٹے؟"

"نہیں ماں" دیپک بے بسی سے بولا تھا "لالہ جی اب اِس دُنیا میں نہیں رہے" سُندری ویران سی نظروں سے اُس کی اور ایک ٹک دیکھنے لگی تھی۔ یہ کیا کہہ رہے ہو دیپک۔ اب کیا ہو گا۔ اب جمنا کا" اِس کے بعد وہ کچھ نہ بول سکی تھی۔ اُسے سارا منڈپ گھومتا ہوا سا نظر آیا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی تھی۔ سارے براتی حیران ہو کر اُس کی اور تکنے لگے تھے اور دیپک "ماں" کہہ کر اُس پر جھک پڑا تھا۔

سمدھی لالہ جی نے چاروں اور گہری نظر ڈال کر غصے سے تلملا کر سارے براتیوں سے کہا تھا "چلو بھئی چلو۔ اب ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ماں بیٹے نے ہمارا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ میں بھی کم نہیں جو اِس کا بدلہ نہ لوں"

براتی باہر جانے لگے تھے۔ اور دیپ سمدھی کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑایا تھا۔

"نہیں لالہ جی۔ میری معصوم بہن پر ایسا ظلم مت کیجئے۔ وہ دُکھ سے پاگل ہو جائے گی"

"ہٹو بھئی۔ ہم نے تمہاری بہن کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔ چلو بھئی سب چلو۔"

لالہ جی نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر کہا تھا لیکن دیپک پھر بھی اُس کے پاؤں پکڑے ہی رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے بھیک مانگتا ہوں لالہ جی۔ میری بہن کی ڈولی ساتھ لیجائیے۔ میں خون پسینہ ایک کر کے جہیز کی پائی پائی چکا دوں گا۔ آپ آج خالی ہاتھ مت لوٹ جائیے لالہ جی۔ میری بہن مر جائے گی۔ مجھ غریب پر احسان کیجئے۔"

لیکن لالہ جی نے اُسے ٹھوکر مار کر اپنے پاؤں چھڑا لئے تھے اور پھر پیر ٹپک کر چلے گئے تھے ——— اور دیپک وہ خالی خالی نظروں سے اُس جاتی ہوئی بن دلہن کی برات کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے لگا تھا جیسے وہ لوگ اُس کی خوشیوں اور عزت کا جنازہ لے کر جا رہے ہوں جمنا اُس کے پاس کھڑی آنسو بھری آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی۔ تبھی دیپک کی نظریں جمنا پر پڑ گئیں اور وہ منہ دوسری اور کئے ہی بولا تھا۔ "جمنا۔ میری بہن۔ مجھ کو معاف کر دے۔ میں تمہیں خوشی نہیں دے سکا۔"

"بھیا۔" جمنا سسکتی ہوئی بولی تھی۔ "مجھے ایسی خوشی نہیں چاہیئے جس کیلئے تمہیں کسی کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑانا پڑے۔"

دیپک سسک پڑا تھا۔ "ہے پربھو۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ کس پاپ کی سزا مجھے مل گئی۔"

کرن نے اُس کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا تھا ——— اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی ——— "یہ سب کیوں ہوا دیپک۔ کیسے ہوا۔"

"آج میں لٹ گیا کرن۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا تھا۔ "کیا سوچا تھا اور کیا ہوا۔ خوب ہنسی اڑائی میری قسمت نے آج۔"

"بھیّا" جمنا روتے ہوتے بولی تھی

"تو فکر مت کر جمنا۔ میری بہن۔ تیرا بھائی ابھی نہیں مرا۔ سب ٹھیک ہو جائیگا جمنا۔ مت رو۔ میری اچھی بہن۔ بھگوان نے چاہا تو تیری شادی اس سے بھی بھلے گھر میں کر دوں گا۔"

دیپک دیر تک جمنا کو تسلّی دیتا رہا تھا۔ اور وہاں شنمدری ابھی تک بے ہوش فرش پر پڑی تھی۔

شنکر سیٹھ نے رتیش کا گلاس پھر سے بھر دیا تھا۔ اور رتیش نے اُس کا ہاتھ روکتے ہوئے اُس سے کہا تھا۔

"بس شنکر بابو بس۔ اب اور نہیں۔"

"بس" شنکر مسکرا کر بولا تھا۔ "ارے یار۔ ابھی تو شروع ہی کیا ہے۔ لو اور پیو رتیش۔ پینا ہی تو زندگی ہے۔"

"نہیں شنکر بابو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں پھر شراب میں خود کو غرق کر دوں گا۔ اور پھر آپ سے اُدھار لیا ہوا پیسہ سب اِسی کی نذر ہو کر رہے گا۔"

شنکر سیٹھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک گہری ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُس کی چال کامیاب ہوتی جا رہی تھی۔ شنکر نے ہی رتیش کو پھر سے شراب نوشی کی لت ڈال دی تھی اور وہ پھر سے سب کچھ بھول کر خوش مستقبل میں کھو گیا تھا۔ اور شنکر سیٹھ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا تھا اُس پر۔ کسی کی خاطر۔ اُس کے دل و دماغ میں کرن بس گئی تھی اور وہ جلد سے جلد اُس کے کنوارے بدن کی

رعنائیاں لوٹنا چاہتا تھا۔ رمیش شنکر سیٹھ پر دل و جان سے قربان ہو رہا تھا۔ وہ اُس کی مہربانیوں کی وجہ سے اُس کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ شنکر سیٹھ نے مسکراتے ہوئے رمیش کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "تم فوراً گھبرا جاتے ہو دوست۔ روپے کی بالکل فکر مت کرو۔ شنکر لال کی تجوریاں ہر وقت تمہارے لئے کھلی پڑی ہیں۔ جب جی چاہے لے لو۔"

"لیکن شنکر بابو۔ آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر مجھ شرابی اور آوارہ کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔" رمیش نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ شنکر سیٹھ ایک فریب بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا تھا۔ "یہ مت بھولو کہ رمیش کانٹے کے ساتھ ایک پھول بھی ہوتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"تمہارے پاس ایک پھول ہے۔ ہیرا ہے۔ موتی ہے۔ ایک انمول موتی۔ جس کو پانے کی شنکر سیٹھ کی آرزو ہے۔"

"لیکن شنکر بابو۔ کون سا پھول۔ کون سا موتی۔ آپ کیا بول رہے ہیں۔" رمیش نشے میں بڑبڑایا تھا۔

"جو بات دماغ میں سما ہی نہ سکے اُس میں اُلجھنے کی کوشش مت کرو رمیش۔ بس تم جام پر جام چڑھائے جاؤ اور موج اُڑاتے رہو۔"

"لیکن شنکر بابو میں سوچ رہا ہوں کب تک آپ کے احسان اُٹھاتا رہوں گا۔ آپ جانتے نہیں شنکر بابو۔ مجھ پر بھی کسی کا بوجھ ہے۔ میری بہن کرن کا۔ آخر میں ہی تو ہوں اُس کا سب کچھ۔ سوچتا ہوں اب اُس کی شادی کر دوں۔ پھر میرا جو بھی انجام ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔"

شنکر سیٹھ کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ جو بات وہ خود رمیش سے کہنے والا

تھا۔ وہی بات آج رتیش نے خود ہی کہہ ڈالی تھی۔ اُس نے اپنی آواز میں مٹھاس بھرتے ہوتے رتیش سے کہا تھا۔

"رتیش تم مجھے اپنا سچا دوست سمجھتے ہو نا۔ تمہیں مجھ پر پورا بھروسہ ہے نا؟"

"آپ کے بغیر اب دنیا میں اور رہے ہی کون شنکر بابو۔ جس کو اپنا کہہ سکوں۔"

"تو فکر مت کرو۔ رتیش۔ شنکر سیٹھ اس معاملے میں بھی دوستی کا حق ضرور نبھائے گا۔ اور وقت آنے پر تم خود سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔" اور رتیش نے "شنکر بابو" کہہ کر اُس کے دونوں پیر گڑگڑا کر تھام لئے تھے۔ اُس کے سامنے شنکر سیٹھ کسی دیوتا سے بھی زیادہ عظیم تھا۔۔۔ اور شنکر سیٹھ۔ اُس کے چہرے پر سے عیّاری ٹپک رہی تھی اور اُس کا ذہن کرن میں اُلجھا ہوا تھا۔

راؤ نے گلاس میں موجود آخری قطرہ تک منہ میں انڈیل دیا اور سامنے بیٹھے فضلو پر ایک گہری نظر ڈال کر بولا۔

"فضلو تم اب بوڑھے ہونے جا رہے ہو۔ جو کام تمہیں سونپا جاتا ہے اُسے پورا نہیں کر پاتے۔"

فضلو صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔ اور راؤ جھنجھلا گیا۔

"جواب دو فضلو تم ہم سے دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہو۔"

"اُستاد۔ آپ سے دھوکہ بازی بھلا کون کر سکتا ہے۔"

"پھر کیا بات ہے۔ کیا تم اب کام کے لائق نہیں رہے۔" راؤ نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں اُستاد۔ میں ایسے کام اب نہیں کر سکتا۔ میرا دل۔ میرا ضمیر جاگ اُٹھا ہے۔ مجھ سے اب کوئی خون نہیں ہو گا۔ کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا جائے گا۔ کیونکہ کیونکہ۔" کہتے کہتے فضلو ہانپنے لگا تھا جیسے دور سے دوڑتا چلا آیا ہو۔۔۔ "کیونکہ میں نے اب اس کام سے توبہ کر لی ہے۔ میں اب آپ کے حکم پر اور جرم نہیں کر سکتا۔

آپ کے کہنے پر کسی کی زندگی

آپ کے کہنے پر کسی کی زندگی نہیں مٹا سکتا۔ کسی کا گھر نہیں جلا سکتا۔ نہیں اُستاد ہرگز نہیں۔ میں آپ کے لئے اپنے اوپر اور گناہ نہیں لے سکتا۔" فضلو کانپ اُٹھا تھا۔

"کون کہتا ہے کہ تم میرے لئے گناہ کرتے ہو۔ فضلو تم سے کس نے کہا کہ تم یہ سب میرے لئے کرتے ہو۔" راؤ گرج کر اُس سے مخاطب ہوا۔

"آج تک ہر مجرم عدالت میں یہی کہتا رہا کہ میں نے جرم تو کیا ہے لیکن کسی اور کے کہنے پر۔ لیکن اُس نے کیوں کیا یہ جرم؟ کس کی خاطر؟ فضلو یہی سوال میں تم سے کروں گا۔" راؤ رک رک کر غضبناک لہجہ میں بول رہا تھا۔

"کیونکہ تم کو روپیوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت تم کو مجھ سے پوری ہوتی اور اس کے عوض میں نے تم سے کچھ کام لئے۔ تم سے جُرم کروائے ــــ فضلو جس خون کو کرنے کے لئے تم نے ڈھیر سارا روپیہ وصول کیا ہے۔ اب وہ خون کرنے کے بعد مجھ سے کہہ رہے ہو کہ تم نے محض میری وجہ سے وہ خون کیا ــــ نہیں فضلو۔ اِس میں تمہاری اپنی مرضی کا دخل تھا۔ اگر تم وہ خون کرنا نہ مانتے تو بولو ــــ میں تمہیں مجبور کیسے کر سکتا تھا ــــ تم نے آج تک جو جرم کئے محض اپنے لئے فضلو ــــ محض اپنی عیّاشی کے لئے۔

"نہیں۔ میں نے عیاش ــــ" فضلو اِس کے آگے بول نہیں سکا کیونکہ راؤ نے بیچ میں ہی اُس کی بات کاٹ دی۔

"محض اپنی عیّاشی کی خاطر۔ ہاں ہاں صرف اپنی خاطر۔" راؤ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"تمہیں دن بھر شراب کی بوتل چاہیئے تھی۔ کیا وہ عیّاشی نہیں تھی؟ تمہیں رات کی تنہائی دور کرنے کے لئے عورت چاہیئے تھی ــــ کیا وہ عیّاشی نہیں؟ تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ مگر اب بھی تم اپنے جذبات کی تسکین چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ کوئی

حسین عورت دن رات تمہاری باہنوں میں پڑی رہے ۔ تم اب آٹھ دس بوتل دن میں چڑھا سکتے ہو نضلو ۔۔۔ اور ۔۔۔ پھر کہتے ہو کہ تمہارا ضمیر بیدار ہو چکا ہے " راؤ نے کہہ کر گلاس کو میز پر پٹک دیا اور گلاس ٹوٹ کر دور دور تک بکھرتا چلا گیا ۔۔۔ راؤ رُکا نہیں ۔ تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا تھا ۔ فضلو مُنہ پھاڑ کر اُس دروازہ کی اور دیکھ رہا تھا جدھر سے کہ راؤ چلا گیا تھا ۔۔۔ راؤ کے الفاظ گرم لوہے کی طرح اُس کے کانوں میں اُتر رہے تھے ۔

دیپک کا دل یک دم دھڑک اُٹھا۔ ریڈیو پر نشر ہوئی خبر سچ مچ ٹھیک تھی۔ کسی کی ناپاک نظریں ہمارے دیش پر اُٹھی تھیں۔ اچانک لوگوں کے ایک جھرمٹ پر اُس کی نظریں گئیں۔ وہ لوگ اخباروں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دیپک نے بھی ایک اخبار حاصل کر لیا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اُس کی نظریں اخبار کی سُرخی پر پھیلنے لگی تھیں۔

"ایک دُشمن ملک نے بھارت پر حملہ کر دیا ہے"۔ ہند سرکار کی اور سے اعلان۔

دیپک پڑھتا گیا۔ پڑھتا گیا۔ اور اُس کی نظریں جیسے اخبار پر جم سی گئی تھیں۔ اُس کا دل ڈوب گیا تھا۔ دُشمن ملک نے کشمیر، نیفا، لدّاخ وغیرہ بھارت کی سرحدوں سے حملہ کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی سارے شہر میں کھلبلی سی مچ اُٹھی تھی۔ لوگ جوش میں آکر نعرے بلند کر رہے تھے — بھارت ماتا کی جے۔ حملے کا جواب حملے سے دو — ہم سب ایک ہیں — اور — سچ بھی تو تھا۔ یہی ایک چیز بھارت کی شان ہے۔ چاہے ہم کتنے ہی فرقے کیوں نہ ہوں۔ کتنے ہی صوبے کیوں نہ ہوں۔ اُس وقت جب ماں۔ بھارت پر کوئی آنچ آئے ہم سب ایک ہو جاتے ہیں۔

نہ کوئی پنجابی، نہ کوئی کشمیری، نہ مدراسی ہی کوئی، نہ بنگالی ہی، گجراتی اور مراٹھی، سب صرف بھارت واسی کہلاتے ہیں۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ایک ہو کر ایک ہی آواز بلند کر رہے تھے — بھارت کی جے۔ ہم بھارت کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے۔ حملے کا جواب حملے سے دیں گے — لوگوں کا جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دیپک کا دل کھل اٹھا تھا۔ ماتر بھومی پر قربان ہونے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

دیپک بڑھتا رہا۔ ہر جگہ۔ ہر گلی، ہر آنگن میں اور ہر گھر میں اس نے یہی کچھ سنا۔ یہی گونج اسے چاروں طرف سنائی دی۔ کسی جگہ جلسے ہو رہے تھے اور سماج کے ٹھیکیدار لوگ چلا چلا کر جنتا سے بول رہے تھے۔ یہ وہی لیڈر تھے جو رات کی تاریکی میں گناہ کرتے رہتے ہیں۔ اور دن کی روشنی میں شریفوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔

کوئی لیڈر زور زور سے کہنے لگا تھا۔ اس کی آواز دیپک کے کانوں تک پہنچ ہی گئی تھی — "آج ہم سب کو آپس کی نفرت ختم کر کے ایک ہو کر دشمن کو کچلنا ہے۔ اور ان باتوں میں آپ خاکسار کو آگے آگے پائیں گے۔" تالیوں کی گونج سے اس پاکھنڈی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ یہ ان کی آواز تھی۔ جو درندے ہوتے ہیں — جو باہر سے شریفوں کا لباس پہن کر شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ اور اندر سے ان کے ہاتھ گناہوں سے رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر سچ مانا جائے تو دیش کے اصلی دشمن یہی لوگ ہوتے ہیں۔ دیش سے غداری کرنے والے —— ذلیل وطن فروش ——

انہی لوگوں میں دیپک کو شنکر سیٹھ کی چلاتی ہوئی آواز بھی سنائی دی تھی۔

وہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہے جا رہا تھا۔

"آج جبکہ بھارت پر دکھ کی گھڑی آئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا

ہوں کہ میرا خون بھی اگر دیش کے لئے کام آیا تو میں انکار نہیں کروں گا۔ ایک ایک پائی تک دیش کی خاطر لٹا دوں گا۔"

دیپک کو اُس کے یہ الفاظ سُن کر ہنسی آئی تھی ــــــ وہ شنکر لال کو ٹھیک طرح سے جانتا تھا ــــــ بھلا شنکر لال جیسے ذلیل لوگ ماترِ بھومی کے لئے کیا کرسکتے ہیں ــــــ دیپک یہی خیال لئے گھر کی اور چل پڑا تھا ــــــ

"راؤ"

"حکم کرو سیٹھ۔"

"پیو۔ آج میرے ساتھ ہی پیو۔ آج ہم خوش ہیں۔ بہت خوش۔" شنکر لال نے شراب کا بھرا ہوا گلاس منھ سے لگاتے ہوئے کہا۔ راؤ سامنے ہی کھڑا کسی کتے کی طرح دُم ہلا رہا تھا۔

"راؤ دنیا کتنی بے وقوف ہے۔ لوگوں کی عقل کہاں ہے۔" شنکر نے ایک زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں شنکر سیٹھ۔" راؤ نشے کے سرور میں بڑبڑایا۔ "یہ کہو کہ دنیا کو بیوقوف بنانے والے کتنے چالاک ہیں۔"

"راؤ۔" شنکر نے پوچھا تھا۔ "پچھلی بار ہمارے بزنس میں جو فرق آیا تھا۔ وہ اب کی بار۔۔۔" شنکر زہر بھری ہنسی ہنس رہا تھا۔

"ضرور پورا ہوگا شنکر سیٹھ۔" راؤ نے بات پوری کر دی تھی۔

"تم نے اس کے لئے کیا کام کیا ہے۔"

"راؤ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا شنکر سیٹھ۔" راؤ شیطانی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاکر بولا تھا۔ "میں نے شہر کی بڑی منڈیوں اور گوداموں میں اپنے آدمی بھیجے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہی جادہ دوں اور ایک آواز سنائی دیگی ـــــ گودام جل گئے۔ منڈیاں خاکستر ہوگئیں اور پھر شنکر سیٹھ لوگ ایک ایک دانے کے لئے تڑپ اٹھیں گے۔"

"لیکن راؤ اس میں اپنا کیا فائدہ۔" شنکر نے حیران ہوکر پوچھا۔

راؤ نے جواب میں ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

"سیٹھ ہوکر بھی ابھی کچے ہو شنکر سیٹھ۔ جب اناج کا ایک دانہ بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لوگ بھوکوں مرجائیں گے۔ تب شنکر اینڈ کمپنی کے گودام کھل جائیں گے۔"

"تو کیا ـــ کیا تمہارا مطلب بلیک مارکیٹنگ سے ہے۔"

"بالکل غلط سمجھے سیٹھ۔ ڈبل بلیک مارکیٹنگ۔" راؤ ہنس کر بولا تھا ـــ اور شنکر سیٹھ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

"شاباش راؤ۔ واقعی تم نے دبش کا نام اونچا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔"

دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجتے رہے۔

"اچھا آؤ اِس خوشی میں ایک ایک جام ہوجائے۔" شنکر نے کہا۔ "ہاں راؤ یہ نہیں بتایا کہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ کہاں تک پہنچا۔"

"اب پھر اہی سمجھ سیٹھ۔" راؤ نے گلاس بھرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"وہ چھوکرا اب اپنے ہاتھ میں ہے۔"

"لیکن۔ کیسے۔" شنکر نے پوچھا تھا۔

"اپنا پیٹ پالنے کی خاطر۔ اپنی بہن اور ماں کو زندہ رکھنے کے لئے وہ کرن کو بھول جائے گا شنکر سیٹھ۔ وہ اپنی عزت کے لئے محبت کو قربان کردے گا۔"

"راؤ۔ تمہاری مشکل میں نے اب آسان کردی ہے۔ تم کو اُس بھکاری سے زیادہ لینا دینا نہیں ہوگا۔ صرف اُسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرو۔" شنکر نے بات سوچ کر کہہ دی۔

"راؤ نے آج تک کبھی مُنہ کی نہیں کھائی شنکر سیٹھ۔ وہ بھکاری میرے پاس بھیک مانگنے ضرور آئے گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں۔ وہ قیامت کتنے دن مجھ سے دور رہ سکتی ہے۔" شنکر سیٹھ سسکاری لے کر رہ گیا۔

دیپک کے دماغ میں کئی خیال آئے اور گئے۔ اور وہ ٹھنڈی سانس لیکر رہ گیا۔ وہ بھارت کے نقشے پر اپنی نظریں گڑائے آنکھوں میں آنسو لئے بیٹھا تھا۔ اُس کے دماغ میں اپنے بچپن کی یادیں اُبھر آئیں۔ اور وہ اُن دنوں کو یاد کرنے لگا تھا جبکہ وہ دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے خوشی خوشی سب دُکھ برداشت کرلئے تھے۔ اور یہ سب اُس پر اسی لئے گذرا تھا کہ وہ ماتربھومی کی پوجا کیا کرتا تھا۔ اور۔ آج اُسی ماتربھومی پر کسی نے اپنی ناپاک نظریں ڈالدی تھیں۔ اُس نے دل کو تھام لیا جو کہ دُکھ اور غم سے بھر گیا تھا۔ ایک دردسا اُٹھا تھا اُس کے دل میں۔ اُس کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو گرتے رہے تھے۔ گرتے رہے تھے۔

"وہ کیا کرے"۔ ایک آواز اُس کے دل سے اُٹھی۔ ایک اور ماں کا غم بھرا دل۔ دوسری اور جمنا کی روتی ہوئی صورت۔ وہ اُن کو پیار دے کر خوش رکھے یا ماتربھومی کے لئے پران دیدے۔!

اب وہ کئی روز سے بیکار بھی تھا۔ سیٹھ رام داس کے قتل کے بعد سے وہ چھپا چھپا سا رہنے لگا تھا۔ اور نوکری۔ وہ تو لالہ جی کے مرنے کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ لیکن گھر کا خرچہ

جلانے کی خاطر اُسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ جمنا کی خوشیاں واپس لانے کی خاطر اُسے دن رات ایک کرنا تھا لیکن وہ کرتا تو کیا کرتا۔ باہر بھی تو نکل نہیں سکتا تھا کہیں پولیس کی نظر اُس پر پڑی تو۔ کئی بار اُسے خیال آیا کہ وہ پولیس اسٹیشن جا کر اپنی صفائی دیکر آئے لیکن پھر اُس کے دل میں خیال آتا کہ اُس کی کوئی نہیں سُنے گا۔ وہ اکیلا ہے۔ غریب ہے۔ اور وہ قانون سے کب تک لڑ سکتا ہے۔

"لیکن قانون کی نظروں سے چھپ کر رہنا۔ یہ بھی تو بذاتِ خود ایک بہت بڑا جُرم ہے"۔ اُس کے دل سے آواز اُٹھی تھی ———

"لیکن میں نے جُرم کیا ہو تب نا"۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر مجھے ڈر کس بات کا ہے"۔

دیپک کسی آخری فیصلہ پر پہنچ کر مطمئن ہو کر کچھ سوچنے لگا تھا۔ پھر اُس کی نظروں میں سارے بھارت کی تصویر گھوم گئی تھی ——— دشمنوں سے گھرا ہوا اُس کا اپنا ——— پیارا دیش بھارت۔ تڑپتی ہوئی خون میں لت پت اُس کے دیش بھگت جوانوں کی لاشیں ——— کسی کی مانگ کا اُجڑا ہوا سندور ——— کسی کے بُڑھاپے کا سہارا ——— مٹتا ہوا ——— کسی بہن کا بھائی ——— تڑپتا ہوا ——— اُسے لگا جیسے ساری ممتا ہی تڑپ رہی ہو اور ماتر بھومی چلا کر پکار رہی ہو ———

"مجھے بچاؤ ——— ظالموں سے بچاؤ ——— میری عزت بچاؤ"۔

"مجھے قربانی دینی ہی ہو گی۔ یہی وقت ہے۔ میں یہ سب کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو کسی کے لال ہیں۔ وہ بھی تو کسی کے بھائی اور کسی کے سُہاگ ہیں۔ جو سرحد پر خوشی خوشی اپنی ماتر بھومی کی عزت۔ آبرو کی خاطر قربان ہو رہے ہیں ——— مجھے بھی جانا ہو گا ——— مجھے بھی جانا ہو گا ——— جانا ہی ہو گا"۔ ——— اُس کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اُٹھی تھیں۔

بھرتی گھر کے باہر دور دور تک نوجوانوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نوجوانوں کی پریڈ سی ہو رہی ہو۔ سارے خود کو دیش کی عزّت کی خاطر قربان کرنے آئے ہوں۔ دیپک کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ اُسے لگا جیسے دُور۔ سرحدوں سے آواز آ رہی ہو ـــ ماترِ بھومی کی ـــ قدم بڑھاؤ ـــ آج میری عزّت آبرو خطرے میں ہے۔ میرے لئے مرو گے تو شہید کہلاؤ گے۔ کیا تم میرے پیارے لال نہیں ہو۔ کیا تم اپنی ماں کی عزّت کا نیلام ہونے دو گے۔

دیپک کے خون میں گرمی بڑھتی گئی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا۔ اور وہ لپک کر اُس قطار میں شامل ہوا تھا جو بھرتی ہو رہی تھی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ دل میں خوشی کا ایک طوفان لئے گھر کی اور بھاگا جا رہا تھا۔ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ دوسرے دن دوپہر تک بھرتی گھر میں حاضر ہو جائے تاکہ اُسے سرحد پر روانہ کر دیا جائے۔ اُس کے پاؤں تیز تیز اُٹھنے لگے تھے۔ اور وہ گھر جلد سے جلد پہنچ جانا چاہتا تھا۔

دیپک دوڑتے دوڑتے ٹھٹھک کر رُک گیا تھا۔ اُس کے کانوں سے زبردست شوروغل کی آوازیں ٹکرائیں۔ اُس نے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑائیں۔ لوگ بدحواس ہو کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے شہر میں ایک بھونچال سا آنے والا تھا۔۔۔

دیپو نے لپک کر ایک راہ گیر کو ہاتھ سے پکڑا تھا اور پوچھا تھا۔ "کیا بات ہے بھائی۔ یہ سب بھاگ دوڑ کیوں ہو رہی ہے"۔

راہ گیر ہانپ کر اُسے حیران نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

"تم کو معلوم نہیں۔ ارے بھائی جلدی سے گھر بھاگنے کی کوشش کرو۔ اگر تمہارے گھر میں اناج کا کوئی دانہ موجود ہے تو جا کر اُس کی رکھوالی کرو۔ اب ایک ایک دانے کے لئے محتاج ہو جاؤ گے"۔

"لیکن کیوں۔ ہوا کیا ہے"۔ دیپک گھبرا کر پوچھ بیٹھا تھا۔

"شہر کے سب گوداموں میں آگ لگ گئی ہے۔ سارے سرکاری گودام راکھ ہو چکے ہیں اور ساتھ ساتھ اناج کی ساری منڈیاں بھی جل رہی ہیں بھائی"۔

"نہیں" دیپک کئی قدم پیچھے ہٹ کر بُت کی طرح کھڑا رہ گیا تھا۔
"لیکن یہ سب کس طرح ہوا۔ کیوں ہوا"۔
"جب دیش پر کوئی آفت آتی ہے بھائی تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔ اتنا کہہ کر راہ گیر پھر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ دیپک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اُس کے بدن سے جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اُسے لگا جیسے اُس کے چاروں اور آگ ہی آگ پھیل گئی ہو اور وہ اُس میں جھلس رہا ہو۔
"نہیں"۔ دفعتاً اُس کے مُنہ سے چیخ سی نکلی تھی"۔ میں جانتا ہوں یہ کس ذلیل کا کام ہو سکتا ہے۔ میں اُس کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالوں گا"۔
پھر وہ ایک سمت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

راؤ نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے دیپک کو گھور کر دیکھا تھا اور پھر ایک زبردست قہقہہ اُس کے کمرے میں گونجا۔

"کیوں۔ ہو گئی تمہاری بہن کی شادی" راؤ نے طنز سے پوچھا تھا "لیکن کیسے ہو جاتی۔ تم بیوقوف جو تھے۔ میری بات نہیں مانی اُس دن۔ میں نے کہا تھا نا۔ تم پھر لوٹ کر آؤ گے۔ میری اِس جنت میں"

"ہاں۔ میں پھر لوٹ کر آیا ہوں۔ لیکن کسی خاص وجہ سے۔ میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا تم نے شہر کے سب گوداموں اور منڈیوں میں آگ لگوا دی ہے"

راؤ پھر ہنسا تھا۔ ایک بھیانک ہنسی۔ اُس کے بھاری جبڑے باہر اُبھر آئے تھے۔ اُس وقت۔ وہ عیّاری سے بول اُٹھا تھا۔

"فرض کرلو۔ آگ میں نے ہی لگوا دی ہے تو پھر"

"تو میں تم کو قانون کے حوالے کر دوں گا"

"تمہارے پاس اِس کا کوئی ثبوت نہیں ہے لڑکے — اور پھر جو خود قانون کا مجرم ہو۔ ایک بھاگا ہوا قاتل وہ مجھے کیا قانون کے حوالے کر سکتا ہے"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ کمینے تم نے لاکھوں کو بھوکا مروایا ہے۔" اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔

"لڑکے جذباتی نہ بنو۔ راؤ کو مارنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ آؤ بیٹھو۔ ایک ایک جام ہو جائے۔"

"میں تمہارے پاس جام پینے نہیں آیا راؤ۔ میں تم سے اُن سب کا حساب چکانے آیا ہوں۔ جن کو تم نے دانے دانے کے لئے محتاج کر دیا ہے۔ میں اُن غریبوں کی فریاد بن کر آیا ہوں جو اب بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں گے۔ تم ذلیل آدمی ہی دیش کے اصلی دُشمن ہو۔ تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔ تم سماج اور دیش کے لئے ایک بدنما داغ ہو۔" دیپک غصّے میں بولتا چلا گیا تھا۔

"گوداموں میں آگ لگا دی میں نے۔ لوگوں کو تڑپنے کے لئے چھوڑا۔ تو میں نے۔ اور اب اگر تم چاہو تو تمہیں بھی ہمیشہ کی نیند سُلا دوں۔"

اتنا کہہ کر راؤ کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی۔ لیکن دیپک کا چہرہ پھر بھی پُرسکون رہا تھا۔ وہ غرور سے سینہ تان کر بولا تھا "مجھے دیش کے لئے مرنے کا کوئی غم نہیں راؤ۔ لیکن میں تب تک چین سے نہیں مروں گا جب تک تم جیسے غدّاروں اور بے رحم لوگوں کا صفایا نہیں ہو جاتا۔"

"تم ابھی نادان ہو لڑکے۔ مان جاؤ۔ اگر تم چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ دھندہ کر روپیہ کما سکتے ہو۔ دن رات عیش کر سکتے ہو۔ کیونکہ تم بہادر ہو۔ حوصلہ رکھتے ہو۔ میرے ساتھ رہو گے تو مالا مال کر دوں گا۔" راؤ نے لہجہ کو نرم کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بُزدل نہیں ہوں راؤ۔ ڈاکہ ڈالنے والے ہی بُزدل ہوتے ہیں جو زندگی کی کشمکش سے تنگ آ کر ڈاکو بن جاتے ہیں۔ اور دیش کو برباد کرنے کے لئے خفیہ اڈّے بنا کر سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ میں بہادر ہوں راؤ۔ محاذ پر جا کر

ہنستے ہنستے وطن کی خاطر جان دیدوں گا۔" دیپک اونچی آواز میں بولا تھا۔

"تاکہ تمہاری ماں اور بہن۔ تمہاری جدائی میں دن رات روتی رہیں۔ تاکہ وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترستی رہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو راؤ۔ دیش کی خاطر میری ماں جیسی سیکڑوں مائیں قربان ہو جائیں تو وہ بھی کم ہے۔ اگر میری ماں بھوکی بھی رہے گی تو اس کی عزت ہمارے دیش میں ہو گی۔ کیونکہ دیش کے لئے دکھ کھانا عزت ہے۔"

راؤ کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ پھر دیپک کی للکارتی ہوئی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔

"میں جا رہا ہوں راؤ ۔۔۔ لیکن اتنا یاد رکھو۔ تم نے اتنے پاپ کئے ہیں کہ کوئی حساب نہیں۔ اور آج تم نے اپنے ہی دیش کو اپنے ہی ہاتھوں سے جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ ایک دن تیری موت بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ ہی ہو گی۔ تمہارا آخری سانس تڑپ تڑپ کر نکلے گا اور اس وقت تم جان جاؤ گے کہ زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔"

راؤ نے زبردست قہقہہ لگایا تھا اور ہنستے ہنستے ہی بولا تھا۔

"میرے دوست۔ تم اب غلط سمجھ رہے ہو ۔۔۔ جو ایک بار یہاں آتا ہے۔ بچ کر نہیں نکل سکتا۔ میں نے ایک بار تم کو جانے دیا ۔۔۔ یہی میری سب سے بڑی حماقت تھی ۔۔۔ اور اب ۔۔۔۔ اب تو تمہاری لاش ہی یہاں سے جائے گی۔"

"تم مجھے جانے سے نہیں روک سکتے راؤ ۔۔۔ اگر دیپک کے راستے میں آج چٹان بھی رکاوٹ بن کر آئے گی۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دوں گا۔" یہ کہہ کر ہی دیپک نے راؤ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ اور راؤ بالکل بھی سنبھل نہیں سکا تھا۔ اور دھڑام سے فرش پر گر پڑا تھا ۔۔۔ اور دیپک وہ اسے فرش پر رگیدتا

چلا گیا تھا۔ دو تین گھونسے ہی راؤ کے لئے کافی ثابت ہوتے تھے۔ دیپک نے اُسے اُٹھنے کا موقعہ ہی نہ دیا تھا۔ راؤ کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا اور اُس کے منہ سے اور ہونٹوں سے اب خون بھی بہنے لگا تھا۔ دیپک غور سے اُس پٹتے ہوئے ذلیل آدمی کو دیکھنے لگا تھا کہ تبھی بالکل اچانک اُس کے سر پہ پیچھے سے کسی نے وار کیا۔ ایک کراہ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھاتا گیا اور وہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ کچھ لمحے بعد وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

دیپک کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اپنے سر کو سہلاتا رہا تھا اور پھر کسی خیال کے تحت وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ اُسے سب کچھ یاد آنے لگا کہ وہ کیسے گر پڑا تھا اور بے ہوش ہوا تھا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر اُسے اپنے سامنے فضلو گھورتا ہوا نظر آیا تھا۔ فضلو کی آنکھیں ویران سی لگ رہی تھیں۔

"تم ہوش میں آ گئے بابو"۔ فضلو نے پوچھا تھا۔ لیکن اُس کی بات پوری ہونے کے ساتھ ہی دیپک نے فضلو پر چھلانگ لگا دی اور اُسے دبوچ لیا تھا پھر سرد سے لہجہ میں فضلو سے بولا تھا۔

"خاموش رہو۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو مجھے یہاں سے بھاگنے کا راستہ دکھلا دو۔"

فضلو تھوڑا سنبھل گیا پھر اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ سی اُبھر آئی تھی۔ ایک بے جان مسکراہٹ۔ وہ دیپک سے بول اُٹھا تھا۔

"فضلو خود اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہے بابو مجھے زندگی کی کوئی چاہت نہیں!"

"کمال ہے۔ تم جیسا خونی اور مُجرم ایسے الفاظ بول رہا ہے۔ تم کو تو اور خون کرنے کے لئے زندہ رہنا ہے فضلو۔" دیپک نے طنز سے کہا تھا "تمہاری تو ایک ہی چاہت ہے کہ تم گناہ کرتے رہو۔ پھر تم زندگی سے اُکتا کیسے گئے۔"

"میں نے آج تک کوئی بھی گناہ چاہت سے نہیں کیا بابو۔"

"راؤ کے کہنے پر کیا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا۔"

"اپنے پیٹ کی خاطر۔ جو سب کچھ کروانے پر اُکساتا ہے۔ میں جب خالی پیٹ لئے در در کی ٹھوکریں کھا رہا تھا تو کسی نے بھی روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہ دیا۔ چاہے بھیک سمجھ کر ہی دیا ہوتا۔ دُنیا صرف ٹھوکر لگانا جانتی ہے بابو۔ صرف ٹھوکر۔" فضلو کی آواز بھر آگئی تھی۔

"بھول رہے ہو تم فضلو۔" دیپک فضلو کا گریبان پکڑ کر چیخا تھا۔

"تمہارے بیان میں کوئی سچائی نہیں۔ کوئی وزن نہیں۔ پیٹ پالنے کے لئے صرف ایک گناہ کا ہی راستہ نہیں ہے فضلو۔ کئی اور بھی راستے ہیں۔ طریقے ہیں۔ لیکن جب انسان اُنھیں اپنا سکے۔ تبھی نا۔ اگر تمہیں صرف ٹھوکر ہی ٹھوکر ملے تھے تو تمہیں اپنی زندگی ختم کر دینی چاہیئے تھی۔ یہ سمجھ کر کہ تم کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ کم از کم دنیش کا نام ڈوبنے سے تو بچ جاتا۔ کم از کم بہنوں کی زندگی تو بچ جاتی۔"

فضلو کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ آئی۔

"ایسا کون کرتا ہے بابو۔ دنیا میں سب جینا ہی چاہتے ہیں۔"

"تو جینے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا کیا؟" دیپک بولا تھا۔

"فضلو مجھے بھی دُنیا نے ٹھوکر ہی دیئے۔ صرف ٹھوکر۔ ٹھوکر کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔ تو کیا میں بھی ڈاکو بن جاتا۔ خونی اور مجرم بن جاتا۔ کیا ایک مجرم اور کیٹرا بننے کے لئے ان ہی سب باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہیں فضلو نہ ایسا

نہیں کیا۔ میں نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔ کشمکش ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ تم نے غلط کیا ہے فضلو۔ جانے کتنے گھر تباہ و برباد کر دیئے ہوں گے تم نے۔ جانے کتنی زندگیوں کو مٹا ڈالا ہو گا تم نے۔"

"ہاں بابو۔ ہاں یہی سب سوچ کر تو کانپ جاتا ہوں۔ کاش خدا مجھے ایک بار معاف کر دے۔" اُس کی آواز بھر آگئی تھی۔

"اتنی زندگیاں گل کر کے بھی۔ تم خدا سے اپنے لئے انصاف مانگتے ہو۔ اب تمہارے چاروں اور ایک ہی چیز ہے فضلو۔ صرف خون۔ اُن معصوموں کا خون جنہوں نے زندگی میں کبھی ہی کوئی گناہ کیا ہو۔ تم صرف خون کرتے جاؤ صرف خون۔ اور پھر ایک دن تم خدا سے انصاف مانگو دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے واسطے انصاف کی دُہائی دو۔ لیکن وہ تم کو دوزخ کی آگ میں جلا جلا کر راکھ کر دے گا۔"

"میں نے اُسی دن توبہ کر لی تھی بابو۔ جب اُس بے قصور غریب کی زندگی ختم کر ڈالی تھی میں نے۔" فضلو کسی سوزش میں ڈوبا ہوا بول اُٹھا۔

"کوئی بے گناہ ہی تو رہا ہو گا فضلو۔" دیپک نے کہا تھا۔

فضلو ماضی میں کھو گیا تھا۔" آج سے لگ بھگ دس سال پہلے کی بات ہے۔ جب شیام لال نام کا ایک غریب انسان میری ہی طرح دُنیا کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے راؤ کی پناہ میں آ گیا تھا۔ راؤ نے اُسے سونے چاندی کے خواب دکھلا کر اپنے ظالم پنجے میں جکڑ لیا تھا۔ لیکن وہ ایک عظیم انسان نکلا۔ ایک معصوم بے قصور بچے کی زندگی بچاتے بچاتے وہ خود قربان ہو گیا۔ بابو۔۔۔ وہ معصوم بچہ اُس کا اپنا ہی بیٹا نکلا۔

جانتے ہو بابو جب وہ معصوم اپنے باپ کی لاش سے لپٹ کر زار و قطار رو رہا تھا۔ تبھی مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کہ میں بے دم ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے پھر بھی گناہ کئے۔۔۔ میں پھر بھی قتل کرتا گیا۔۔۔ کہتے کہتے وہ ٹہر پڑا تھا

فضلو ـــ دیپک کے دماغ میں ایک طوفان سا اُٹھا ہوا تھا۔ ماضی کی یادوں میں کھوتے کھوتے وہ چونک کر فضلو کی اور دیکھنے لگا تھا۔ اچانک کسی خیال کے تحت اُس نے فضلو کا گریبان تھاما اور بول پڑا تھا "تم نے وہ قتل سن رائنز کلب کے باہر ٹرک پر کیا تھا۔"

"ہاں بابو۔ لیکن تم ـــ تم۔" فضلو خوفزدہ انداز میں دیپک کے سُرخ اور تمتماتے چہرے کی اور نظریں ڈال کر کانپ گیا۔

"کمینے۔ ذلیل۔ درندے۔ جانتے ہو وہ بچہ کون تھا ـــ وہ میں تھا ظالم۔ تم نے۔ صرف تم نے میرے باپ کو مار ڈالا۔ تم خونی ہو۔ بولو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کمینے تم نے ہمارے سکھی سنسار میں آگ لگا دی۔ میں تجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دوں گا۔ تاکہ ـــ تاکہ تم پھر کسی کی زندگی نہ مٹا سکو۔"

اور ـــ فضلو۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیپک کی اور دیکھ رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے دیپک آج بھی شیام لال کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہا ہو اور پھر فضلو سے اپنے لئے انصاف مانگ رہا ہو۔ دیپک کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا۔ اور پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے فضلو کی گردن پکڑ کر دبانی شروع کی تھی۔ اور دباتا ہی چلا گیا تھا۔ اور فضلو۔ لگ رہا تھا جیسے وہ خوش ہو رہا ہو۔ اُس نوجوان کے ہاتھوں مرنے میں۔ اُسے لگا تھا جیسے آج وہ دیپک کے ساتھ انصاف کر رہا ہو۔ لیکن تبھی دیپک کی پکڑ ڈھیلی پڑتی گئی اور وہ بھرائی آواز میں بولا تھا ـــ "میں تم کو نہیں مار سکتا ذلیل۔ تم جیسے ناپاک آدمی کو مارنا اپنے ہاتھ ہی گندے کرنا ہے۔ خدا تم سے خود ہی حساب لے گا۔"

"نہیں بابو نہیں۔" فضلو رو پڑا تھا "مجھے مار ڈالو ـــ مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کر ڈالو۔ میں تمہارا مجرم ہوں بابو ـــ میں خونی ہوں۔ ذلیل ہوں۔" لیکن دیپک اُس کی

ادھر سے اپنا دھیان ہٹا چکا تھا۔ وہ دفعتاً دیوار کی اور جھپٹ پڑا تھا۔ جہاں اُسے ایک نیلی لکیر سی نظر آتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گہری چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے دیوار پر ایک جگہ زور لگایا۔ دیوار میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک دراز سی ہو گئی اور پھر دیپو نے باہر چھلانگ لگا دی۔ لیکن تبھی راؤ کی آواز نے اُس کے قدموں کو روک لیا تھا۔ راؤ کے ہاتھ میں پستول دکھائی دیا تھا اُسے۔

"نہیں میرے دوست۔ تم نے دیر کر دی۔ اب تم اِس جگہ سے زندہ نہیں جا سکتے۔" پھر اس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہارے یہ کھلونے دیپک کو اپنے مقصد سے روک نہیں سکتے راؤ۔ میں یہاں نہیں مر سکتا۔ مجھے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔ تمہاری ایک حرکت تمہاری زندگی کو گُل کر دے گی نوجوان۔ راؤ نے آج تک کبھی مات نہیں کھائی۔" راؤ شیطانی ہنسی ہنس کر بولا تھا۔

"لیکن آج تم ہار گئے راؤ۔" فضلو نے اچانک کہا تھا اور پھر دیپک کے آگے آتا ہوا دیپک سے بول اُٹھا تھا۔ "بھاگ نکلو بابو۔"

"فضلو ہٹ جاؤ۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔" راؤ چلایا تھا۔

اتنی دیر میں دیپک نے ایک جست کی اور باہر کی اور مڑا۔ راؤ نے گولی چلا دی اور فضلو کی ایک دل ہلا دینے والی چیخ سنائی دی۔ دیپک دوڑتا ہی رہا۔ اور۔۔۔ فضلو وہ فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔۔۔ اور راؤ غصّے کی شدّت سے مُٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

سُندری نے دیپک کو دُور سے آتے دیکھا اور ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے دیپک کچھ پریشان سا نظر آیا۔ دیپک کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور کپڑے بھی بے ترتیب ہو رہے تھے اور وہ ہانپ رہا تھا۔ سُندری کا دل دھڑک اُٹھا۔ جونہی وہ گھر کے دروازے سے لگ کر دم لینے رُکا۔ سُندری دوڑ کر اُس کے قریب آئی اور گھبرائی سی اُس کے ماتھے کو چوم کر بولی تھی۔

"تو آگیا بیٹے۔ میں تو گھبرا گئی تھی دیپک۔ بھگوان کا شکر ہے۔"

"ماں۔ تو اتنی گھبرا کیوں گئی تھی۔ میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔ جو کہیں کھو جاؤں گا۔"
وہ ماں کے سینے سے لگ کر تسکین پانے لگا تھا۔

"بیٹے صبح سے چاروں طرف زور زور سے نعرے۔ آوازیں اور شور کے بغیر کچھ بھی تو نہیں سُنا میں نے۔ اور پھر سُنا کہ کہیں آگ لگ گئی۔ گولی بھی چلی ہے اور لاٹھیاں بھی چلی ہیں۔ میں تو ڈر گئی تھی۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم آ گئے۔"

"آ گیا ہوں ماں۔ اور۔ اور۔" دیپک ایسا کہتے ہوئے ماں کی اور غور سے دیکھنے لگا تھا۔ "جا بھی رہا ہوں ماں۔"

"کہاں۔ کدھر جا رہے ہو تم۔" سُندری نے گھبرا کر پوچھا تھا۔ "تم تو نوکری کی تلاش میں گئے تھے۔"

"ہاں ماں۔ لیکن سب لوگوں نے دُھتکار دیا۔ یہ سماج۔ یہ دنیا۔ یہ دولت والے بڑے سنگدل ہوتے ہیں ماں۔ پاؤں پکڑ کر اُن سے کچھ مانگ لو پھر بھی دُھتکار ہی دیتے ہیں۔"

"پھر گزارہ کیسے چلے گا بیٹے۔ اب کیا ہوگا۔" ماں فکر مند سی ہو گئی۔

"ماں تو تو فکر کرنے لگی۔ تم نے پوری بات سُنی ہی نہیں مجھے ابھی ہی نوکری ملی ہے۔ لیکن۔" کہتے ہوئے دیپک کچھ ہچکچایا ۔۔ اور سُندری کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"بیٹے۔ تجھے میری عمر لگ جائے۔ جلدی بول۔ کیسی نوکری ملی ہے۔"

"میں سپاہی بن کر محاذ پر جا رہا ہوں۔ ماں۔"

ایک بارگی ماں سُندری کانپ سی گئی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا تھا اور چہرہ زرد ہو چلا تھا۔

"یہ تو کیا بول رہا ہے بیٹا۔ جانتا ہے محاذ پر کون جاتا ہے۔" سُندری کانپتے ہوئے بولی تھی۔

"جانتا ہوں ماں ۔۔ محاذ پر وہی جاتا ہے جس کو اپنی ماترِ بھومی۔ اپنی ماں سے پیار ہو۔ وہ اُس کی من سے عزت کرتا ہو۔ اور ماں۔ تو تو جانتی ہے۔ میں نے اُس کی خاطر کتنے دُکھ پائے ہیں۔ اب ماترِ بھومی پر آفت آئی ہے۔ میں کس طرح برداشت کروں ماں ۔۔ میں جان کی بازی لگاؤں گا ۔۔ اُس کی عزت کی خاطر جانتی ہو ماں۔ باپو نے بھی مرتے وقت مجھ سے یہی وچن لیا تھا۔ مجھے وہ وچن پورا کرنا ہے ماں۔" دیپک اٹل فیصلے سے بولا تھا ۔۔ ماں کا دل ایک دم ڈوب گیا تھا۔

وہ اپنے دل کے درد کو چھپا نہیں سکی تھی۔ اور اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

" آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے بیٹے۔ تجھے اپنی بوڑھی ماں کا خیال نہیں تو اپنی جوان بہن کا تو کچھ سوچ لے۔ اِس بیچاری کی تو ابھی ڈولی بھی نہیں اُٹھی۔ کیا تو اُسے سماج کے ظالم ہاتھوں میں چھوڑ کر جائے گا۔" وہ رو پڑی تھی۔

" ماں۔ یہ تو کیا بول رہی ہے۔ اِسی بات کی تو فکر ہے۔ لیکن وہ بھی تو میری ماں ہے۔ اُس کی عزّت خطرے میں ہے۔ اگر اِس وقت بھی میں پیچھے رہا تو یہ زندگی کس کام کی ماں۔ اب تو مجھے آشیرواد دے اور جانے سے مت روک۔"

" مگر ہم تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے دیپک۔ تمہارا ہی ایک اُمید۔ ایک آسرا ہے۔ اور کس کے سہارے جئیں گے بیٹے۔"

" ایک سہارا سب سے بڑا ہوتا ہے ماں۔ اور وہ ہے قربانی۔ جو اپنے دیش پر قربان ہو جاتے ہیں۔ وہ امر کہلاتے ہیں۔ اور پھر اوپر بھگوان بھی سب کچھ دیکھتا ہے ماں۔ اُس کے سوا غریب کا ہوتا ہی کون ہے۔ میں اگر دیش کی خاطر کچھ کر سکا تو یہ میری سب سے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر میری جان بھی جائے گی تو بھی کیا۔ دُنیا تو تیری عزّت کرے گی۔ ہر ایک تم سے یہی کہے گا کہ تم دیوی ہو جس نے دیپک جیسے بیٹے کو جنم دیا۔ ماتر بھومی کو تم پر ناز ہوگا۔ وہی تو اصلی زندگی ہے۔ دیش کے لئے کچھ کرنا اور عزّت سے رہنا۔ ورنہ اِس زندگی میں تو صرف ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں۔ اور کچھ بھی تو نہیں۔"

دیپک ماں شُندری کو دلاسے دیتا رہا اور سمجھاتا رہا۔ لیکن ماں تو ممتا سے بھری ہوتی ہے کیسے اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں سے دور کر دے۔ کیسے اُسے موت کے منہ میں جانے دے۔ وہ جانتی تھی۔ سرحد پر جانے والا کبھی کبھار ہی لوٹتا ہے یہی سوچ کر شُندری کی آنکھیں برس پڑیں۔ وہ اپنے دل کے زخموں کو چھپا نہ سکی۔

دیپک کا دل ماں کے آنسو دیکھ کر ڈوبنے لگا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ ماں کے آنسو

اور اُس کے دل کا درد اُسے محاذ پر جانے سے روک لیں گے۔ تبھی جمنا پاس آکر بولی تھی۔
"بھیا کرن دیدی اور اُس کا بھائی رتیش بابو آرہے ہیں" اور پھر ماں کو روتا دیکھ کر
وہ ٹھٹھک پڑی تھی۔

"ماں تو رو رہی ہے۔ ضرور بھیّا نے اُلٹی سیدھی بات کہی ہوگی"

"تیرا بھیّا محاذ پر جا رہا ہے جمنا" کہہ کر سُندری وہاں سے فوراً چلدی تھی۔
جمنا حیران رہ گئی تھی۔ اُسے جھٹکا لگا تھا۔ پھر وہ بھائی سے لپٹ کر بول پڑی
تھی "کہیں تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا بھیا۔ محاذ پر کیوں جاؤ گے۔ کرن کے بھائی
نے تو تجھے یہاں ہی نوکری دلوانے کو کہا ہے۔ کرن دیدی مجھ سے کہہ رہی تھی"
دیپک کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ رتیش نے کس لئے ایسا سوچا ہے؟

رمیش اور کرن جونہی داخل ہوئے تھے۔ دیپک مسکرا کر سامنے آ گیا تھا۔ رمیش نے جمنا کی ہلکی سی جھلک دیکھ لی تھی اور وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ جمنا کو آج وہ بہت عرصہ بعد دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ جمنا کی معصوم موہنی صورت۔ درمیانہ قد۔ سڈول بانہیں۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ موٹی خوبصورت آنکھیں کنول جیسی۔۔ رمیش کے دل میں کھلبلی سی ہونے لگی تھی۔ اور تبھی وہ دیپک کی آواز پر چونک پڑا تھا۔

" رمیش بابو۔ آپ اور اِس جھونپڑی میں۔ مجھے حیرت ہے۔ آپ نے اِدھر آنے کی تکلیف کیسے کی؟"

کرن رمیش کے بولنے سے قبل ہی بول اُٹھی تھی۔

" بھیّا کو میں لائی ہوں دیپک۔ تم آج سے اِن کے ساتھ کام کرو گے۔"

" ہاں دیپک۔ اگر تم چاہو تو میں تم کو نوکر رکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس کاروبار ہے۔ کام کرلو۔ تمہارا گذارہ چل سکتا ہے۔"

رمیش نے بہت عرصہ بعد دیپک سے بات کری تھی۔ دیپک کے چہرے پر ایک

طنز بھری مسکراہٹ رینگ آئی۔ اور وہ رتیش سے پوچھ بیٹھا تھا۔" رتیش بابو۔ آج یکا یک آپ کو ہم پر دیا کیسے آگئی۔ کوئی نیک ارادہ تو نہیں "۔

" تم کچھ بھی کہو۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہاں اتنا ہی کہنے تمہارے پاس آیا تھا۔ وہ بھی کرن نے مجبور کیا۔ ورنہ شنکر بابو تو تم کو نوکر رکھنے کے بالکل حق میں نہیں تھے "۔

" شنکر سیٹھ کیسے راضی ہوتا رتیش بابو۔ بھلا اُس جیسے ذلیل۔ وطن دشمن اور کمینہ انسان کی اتنی جراًت ہو سکتی ہے کہ دیپک کو نوکر رکھ لے۔ رتیش بابو مجھے آپ کی نوکری نہیں چاہیئے۔ جہاں شنکر جیسے ناپاک لوگ موجود ہوں وہاں میرے پاؤں نہیں پڑ سکتے "۔ رتیش۔ ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوتا گیا اور پھر وہ غصے کی شدت سے بول پڑا تھا۔" تم وہی گنوار کے گنوار رہو گے۔ کاش مجھے کرن کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں اچھا سبق دیتا۔ تو نے آج میرے دوست میرے محسن کی توہین کی ہے۔ اُسے ذلیل کہا ہے بھکاری ہو کر ایک راجہ سے ٹکر لی ہے۔ میں نے تجھے بھکاری جان کر بھیک دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن وہ بھی تیرے نصیب میں نہیں ہے "۔

" رتیش بابو۔ جو خود بھکاری۔ جو خود شنکر سیٹھ سے بھیک مانگ کر لایا ہو وہ دوسروں کو کیا بھیک دے سکتا ہے۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ گھر آتے ہوئے مہمان پر ہاتھ اُٹھاؤں "۔

" جا رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا۔ اگر آج کے بعد تو نے کرن کے بارے میں خواب میں بھی سوچا تو میں تیری جھونپڑی کو راکھ کر کے رکھ دوں گا۔

" چلو کرن "۔ اُس نے کرن کو گھسیٹ کر لیجاتے ہوئے کہا تھا اور کرن روتی ہی رہ گئی تھی۔

”یہ تو نے اچھا نہیں کیا بھیّا۔ اب کیا ہوگا“ جمنا سسکتی ہوئی بولی تھی۔

”جمنا۔ اُس ذلیل کمینے کی نوکری کرنے کے بجائے میں زہر کھانا پسند کروں گا۔ تو فکر مت کر میری بہن۔ اب تو میری ایک ہی منزل ہے“

”مگر ہمارا کیا ہوگا۔ ہم کہاں جائیں گے بھیّا“ جمنا روتی ہوئی بولی تھی۔

” تو دیپک کی بہن ہے جمنا۔ میں جانتا ہوں۔ تو بُزدل نہیں۔ تم اپنی عزّت پر آنچ نہیں آنے دوگی۔ بس اب تو ایک ہی پرارتھنا ہے بھگوان سے۔ جب تک میں نہ لوٹوں۔ تم دونوں پر دُنیا کی ظالم اور بُری نظریں نہ پڑ سکیں“

”بھیّا“ کہہ کر جمنا دیپک سے لپٹ گئی تھی۔

دیپک بھگوان کی مورتی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو گرتے جا رہے تھے اور وہ درد بھری آواز میں بھگوان سے پرارتھنا کئے جا رہا تھا۔

"پربھو۔ تم تو جانتے ہو ہر ایک بات۔ دنیا غریب کو کتنے دُکھ دیتی ہے۔ ہر ایک اُسے ٹھوکر ہی مارتا ہے۔ پربھو میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ ٹھوکر کھا سکتا ہوں مگر ماترِ بھومی کی دُردشا نہیں دیکھ سکتا۔ میں جا رہا ہوں بھگوان۔ کچھ تو کر لوں اپنی بھارت ماں کی خاطر۔ بس ایک پرارتھنا ہے تم سے۔ میری دُکھی ماں اور بہن کی رکھشا کرنا پربھو۔ رکھشا کرنا۔" کہتے کہتے دیپک رو پڑا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر۔

تبھی کسی نے اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ چونک کر مڑا۔ اُس کے پاس کرن کھڑی تھی۔ اُداس۔ آنسو بھری آنکھیں لئے۔ وہ دیپک کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

دیپک کے دل کو پھر ایک دھکّہ سا لگا۔

"میں ایک غریب اور دُکھی ماں کا بیٹا ہوتے ہوتے بھی پتّھر کا دل رکھتا ہوں۔ ایک معصوم غریب بہن کا بھائی ہو کر بھی میرے ارادے چٹّان کی طرح مضبوط اور سخت ہیں۔

مگر تو ۔ دور ہی ہے کرن ۔"

"تم مت جاؤ دیپک ۔ مت جاؤ ۔ مجھے چھوڑ کر" وہ دیپک سے لپٹ کر بولی تھی ۔ "مجھے دُنیا سے ڈر لگتا ہے ۔ تم کو ہی ایک اپنا سمجھتی رہی ہوں ۔ تم مجھے بے آسرہ چھوڑ کر مت جاؤ ۔"

وہ کرن کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا ۔ اُس کو تسلّی دیتا رہا ۔

"دل چھوٹا مت کرو کرن ۔ میں مرنے تھوڑے ہی جا رہا ہوں ۔ اگر ہمارا پیار سچّا ہے ۔ تو ہم ضرور ملیں گے ۔ اِس دنیا میں نہ سہی ۔۔۔ لیکن مر کر بھی میں تمہیں پا لوں گا ۔ کرن ۔ بھلا کرن دیپک سے دور رہ سکتی ہے ۔ جب دیپک جگمگا اُٹھے گا ۔ کرن اُس کے روم روم میں بس چکی ہوگی ۔"

"لیکن میرا دل نہیں مانتا مجھے تو ایسا لگتا ہے دیپک کہ اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے ۔ اب ایک طوفان آنے والا ہے جس میں ہم سب سما جائیں گے ۔" کرن بے بسی سے بولی تھی ۔

"اگر بھگوان کی یہی مرضی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں کرن ۔" دیپک نے ایک سرد سی آہ بھر کر جواب دیا تھا ۔

"دیپک ایک بات پوچھوں ۔"

"ہاں ۔"

"تم اِدھر ہی نوکری کیوں نہیں کر لیتے ۔"

دیپک مسکرا دیا تھا ۔ ایک مُردہ سی مسکراہٹ ۔

"ہر طرف لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر چلا رہے ہیں ۔ لوگ ایک دوسرے پر بُری نظر ڈالے ہوتے ہیں اور ماترِ بھومی ۔ بھارت ماں کا خیال کسی کو نہیں ۔ اِس صورت میں مجھے نوکری کون دے گا کرن ۔ اور پھر دیش کو اِس وقت میری ضرورت ہے ۔"

کرن نے آہ بھر کر پھر دیپک سے پوچھا تھا ۔" مگر یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔ یہ لوگ

اتنے وحشی کیوں ہو گئے ہیں دیپو۔"

"شنکر سیٹھ جیسے ناپاک اور خود غرض لوگوں کی لگائی ہوئی آگ سے۔ جو تب تک نہیں بجھ سکتی جب تک کہ وہ اس دھرتی پر زندہ ہیں۔۔۔ ہاں کرن۔ یہ سچ ہے۔ کسی دیش پر آفت لانے والے اُسی دیش کے واسی ہوتے ہیں جو نہ ضمیر رکھتے ہیں اور نہ دل۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی بھی طرح دولت بٹور سکیں چاہے انہیں اپنی سچی ماں ہی کیوں نہ بیچنی پڑے۔" دیپک کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا غصّے سے۔

"ہاں کرن۔ میں ایک ضروری بات تم سے کہنے والا تھا۔ بُرا مت ماننا۔ تمہارا بھائی رمیش شنکر سیٹھ کے جال میں بُری طرح پھنس چکا ہے۔ چاندی اور سونے کی چمک رمیش کو تباہ کر رہی ہے۔ اور شنکر سیٹھ۔۔۔ یہ سب یونہی نہیں کر رہا ہے۔ اُس کے دل میں کیا ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم۔" لیکن کرن نے اُس کی بات کو بیچ میں ہی کاٹ کر کہا تھا۔" نہیں دیپک۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اُس سے قبل ہی کرن ہمیشہ کے لئے مِٹ جائے گی۔ میرے دیوتا صرف تم ہو۔۔۔ صرف تم۔ میں جیتے جی اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔"

"کرن۔" دیپک کے مُنہ سے، دل سے نکلا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے میں سما گئے تھے۔۔۔ کرن سسکیاں بھر رہی تھی۔

محاذ پر جانے والے بھرتی کئے گئے نوجوان اپنے گھر والوں سے گلے مل کر گاڑیوں میں بیٹھے جا رہے تھے۔ اور سُندری کا دل ہر منٹ پر بیٹھا جا رہا تھا۔ آج اُس کا پیارا بیٹا۔ لال۔ جگر کا ٹکڑا۔ اُس سے دُور جا رہا تھا جس کے لئے سُندری نے ساری زندگی محنت کی۔ اور خون پسینہ ایک کر کے رکھ دیا تھا۔ وہی لال آج سرحد پہ جا رہا تھا۔ سُندری کا دل کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی شاید وہ اُسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ اور جمنا آنکھوں میں آنسو لئے دیپک کی اور دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کا پیارا بھائی جیسے وہ آج تک راکھی باندھتی آئی تھی کہ وہ اُس کے جیون کی رکھشا کرے۔ وہی اُس کے جیون سے دور جا رہا تھا۔ اور کرن وہ تو چُپ چاپ کھڑی تھی۔ جیسے اُس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو۔

دفعتاً دیپک نے سُندری ماں کے پاؤں چھوئے اور کھڑا ہو گیا۔

"ماں مجھے آشیرواد دو۔ تاکہ میں کچھ کر سکوں۔ دنیا مجھے بہادر کہہ کر پکار سکے۔"

اور پھر وہ ماں کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولا تھا" رو رہی ہے تو ماں — تم کو تو خوش ہو جانا چاہیئے کہ آج تیرا بیٹا کوئی نیک کام کرنے جا رہا ہے۔

ماتر بھومی — اپنے دیش کی خاطر — اپنا خون بہانے جا رہا ہے۔ مجھے خوشی خوشی وداع کر دو ماں —

وہ روتی رہی — روتی رہی — اُس کے دل و دماغ میں جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں — اُس کی آنکھوں میں آنسو اور ٹانگوں میں کپکپی سی طاری ہو چکی تھی اور وہ جیسے کہ دور بہت دُور ہوا میں اُڑتی جا رہی تھی — اور جمنا وہ روتی رہی تھی۔

"پگلی" دیپک نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا "مت رو۔ میری اچھی بہن مت رو — دیکھو آج اپنے بھیا کو ہنستے ہنستے وداع کر دو۔ نہیں تو میرا دل ہمیشہ روتا ہی رہے گا اور پھر شاید میرے قدم دشمن کو کچل نہیں سکیں گے!"

جمنا نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اپنے بھائی کی اور دیکھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی — "جاؤ بھیا جاؤ — میں ہر وقت بھگوان سے پرارتھنا کرتی رہوں گی کہ میرے بھیا کو میری عمر بھی لگ جائے — دیکھو بھیا — میری راکھی کو مت بھولنا۔ بہن کا سب کچھ اُس کی راکھی ہوتی ہے — تم اُسے بھول گئے تو میں سمجھ لوں گی کہ تم اپنی جمنا۔ اپنی بہن کو بھول گئے!"

"پگلی۔ کبھی راکھی کا بندھن بھی ٹوٹتا ہے۔ اچھا جمنا ایک بات سُن۔ تم رونا نہیں۔ تم روؤ گی تو مجھے دُکھ ہو گا۔ میں لوٹ کر آؤں گا۔ پھر تیری شادی ہو گی تمہاری ڈولی اُٹھے گی میری بہنا" کہتے ہوئے دیپ کی آواز بھرا گئی اور اُس نے جمنا کو یکبارگی زور سے سینے سے لگا لیا۔ اور جمنا اُس کے برداشت کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر دیپک کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

"مت رو۔ میری بہن مت رو۔ میری لاڈلی مُنی مت رو۔ تیرے لئے میں اپنا سب کچھ لُٹا دوں گا۔ میری مُنی۔ میری گڑیا!"

تبھی کمانڈر کی آواز گونج اُٹھی۔ وہ بھرتی شدہ نوجوانوں کو حکم دے رہا تھا کہ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جائیں تاکہ چلنے کا سگنل دیا جائے۔

دیپک نے ایک بار پھر ماں سُندری کے چرن چھوئے اور بولا تھا۔

"اچھا ماں ۔۔ پرنام" وہ مڑا۔ اور تبھی ممتا کا ساگر ایک دم پھوٹ کر بہنے لگا۔

"دیپو" کہہ کر سُندری ماں نے اُسے اپنی ممتا سے بھری ہوئی باہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اُسے چوم رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ دو تین سال کا بچہ رہا ہو۔

"جاؤ میرے لال جاؤ۔ میرا آشیرواد تیرے ساتھ ہے۔ جاؤ اور کچھ کرکے آؤ تاکہ پھر کوئی تمہیں یہ نہ کہہ سکے کہ تم ماتر بھومی کے کام نہیں آتے۔"

دیپک آگے بڑھ گیا۔ اور پھر اچانک اُس کے قدم رُک گئے۔ کیونکہ ایک تیسری ہستی بھی وہاں کھڑی تھی۔ اپنی آنکھوں میں پیار کے سچے آنسو لئے ہوئے۔ دیپک کرن کے پاس چلا آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔

"میں جارہا ہوں کرن۔ بھگوان تیری رکھشا کرے۔"

"میں آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی دیپک۔" کرن کا سارا وجود بول اٹھا تھا۔ اُس کے روم روم سے آواز نکلی تھی۔

"یقین رکھو کرن۔ مرنے سے پہلے تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔" اور پھر وہ بیباک نوجوان گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ سُندری ماں۔ جمنا اور کرن۔ اپنی اپنی جگہ پر ویران اور خالی خالی نظروں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جب تک ساری گاڑیاں اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئیں وہ اُدھر ہی ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا تھا۔

کرن جونہی گھر میں داخل ہوئی تھی اُس کا سامنا رمیش سے ہوا۔ رمیش کی آنکھوں میں زہر جھانک رہا تھا لیکن کرن مطمئن رہی تھی۔

”تم روز روز اُسی بھکاری کے گھر کیوں جاتی ہو؟“

”بھیا!“ کرن نے اُداس لہجہ میں جواب دیا تھا۔ ”وہ دُکھی ہیں بھیا۔ اُن کا ایک ہی تو سہارا تھا — دیپک — وہ بھی چلا گیا۔ اب اُن کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں۔“

”کیوں“! رمیش نے طنز کیا۔ ”تمہارا چہرہ ایک بار گی اُتر کیوں گیا ہے۔ اُس کی یاد آگئی ہوگی — تم سے کتنی بار کہا ہے کرن کہ اُس بھکاری سے ناطہ توڑ دو۔ آخر تو سمجھتی کیوں نہیں۔ کیا تمہیں میری عزّت کا کوئی خیال نہیں۔ آخر لوگ کیا کہتے ہوں گے۔“

”لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ جو تمہاری نظروں میں بھکاری ہے وہ کتنا مہان ہے۔ لوگ یہ بھی جانتے ہیں۔“

”لیکن جب تک رمیش زندہ ہے۔ تمہیں اُس کے حوالے نہیں کر سکتا۔“ اور پھر کون جانے وہ محاذ سے واپس بھی آئے کہ نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا

ہے کرن اور ۔ اور وہ تمہیں ماننا ہی پڑے گا۔"

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے۔" کرن اُسے تیکھی نظروں سے گھور کر بولی تھی۔

"شنکر بابو اس شہر کے سب سے بڑے رئیس ہیں۔ کیا نہیں ہے اُن کے پاس۔ روپے۔ موٹر۔ بنگلے۔ نوکر۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری شادی شنکر بابو سے ہی ہوگی۔"

"بھیا" کرن تیز ہوتی ہوئی بولی تھی۔" تم نے اُس شیطان کا صرف ایک ہی روپ دیکھا ہے۔ کاش تم اُس کی فریب بھری باتوں میں نہ آ گئے ہوتے لیکن یہ بھی کان کھول کر سُن لو۔ جیتے جی میں اُس کے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں۔"

"لیکن اُن کی بہت سی مہربانیاں ہیں ہمارے اوپر۔ وہ سہارا نہ دیتے تو ہم کب کے بھوک سے مر گئے ہوتے۔"

"تو ۔ کتنا ہی اچھا ہوتا ۔ ایک بار ہی تو موت آتی۔" کرن نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تھا۔

"کرن" رمیش چلّا پڑا تھا۔" کیا بک رہی ہے تو۔ تمہیں میرے فیصلہ پر سر جھکانا ہی پڑے گا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے ۔ کہ تم اپنی بہن کا سودا چاندی کے چند سکّوں کے عوض شنکر جیسے ذلیل کے ہاتھوں کرنا چاہتے ہو۔ اُس کمینے کے ہاتھوں روز کتنی زندگیاں برباد ہوتی ہیں یہ جانتے ہو۔" کرن آگ بگولا سی ہو گئی تھی ۔"اُس ظالم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے دیش کو آگ لگائی ۔ اور تم میری زندگی کا سودا اُسی کے ہاتھوں کرنا چاہتے ہو۔ کتنی گندی آتما ہے تمہاری بھیا مجھے تو تمہیں بھیا کہتے ہوئے بھی دُکھ ہوتا ہے۔"

"کرن" رمیش نے نرمی سے کام لینا چاہا تھا۔" تم بیوقوف مت بنو۔ تم

شنکر بابو کی تینی بن کر اِس شہر کی رانی بن جاؤ گی۔"

"نہیں۔ میں کسی شہر کی رانی نہیں بننا چاہتی۔" کرن نے لگ بھگ رو دینے والے انداز سے کہا اور اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی شنکر سیٹھ نے اندر آتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ وہ دیر سے دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔

"لیکن کرن دیوی۔ آپ اُس بھکاری کا خیال دل سے کیوں نہیں نکال سکتیں ـــ"

کرن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہاں سے چل دی۔ اُس کا دل ڈوب گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر پلنگ پر گر پڑی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اور ـــ رمیش شنکر سیٹھ کو سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ جھینپتے ہوئے اُس کی زبان سے نکلا تھا۔ "شنکر بابو آپ ـــ ہماری قسمت ہے کہ آپ نے غریب خانہ پر تشریف لانے کی زحمت کی۔ بیٹھیئے۔" وہ اُس کو کرسی پیش کرتے ہوئے بولا تھا۔

لیکن شنکر بابو کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ رمیش اس بات کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور یہی سوچ کر وہ شنکر سیٹھ سے بولا تھا۔

"آپ گھبرایئے مت شنکر بابو۔ میں اُسے راضی کر لوں گا۔ وہ صرف آپ کی ہے۔ صرف آپ کی ـــ" اور ـــ شنکر سیٹھ حقارت سے مُسکرایا تھا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے رمیش۔ لاؤ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ دودھ دودھ ہوتا ہے اور پانی پانی ہی۔"

"کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں رہا شنکر بابو۔" رمیش گڑگڑایا۔

"جو خود شراب کے ہاتھوں بِک گیا ہو۔ اُس کا کیا بھروسہ میرے دوست۔ خیر اب ایک ہی راستہ ہے۔ یا تو مجھے کرن چاہیئے یا مجھ سے لیا ہوا قرض۔" اور ـــ تبھی کرن کسی شیرنی کی طرح بپھر کر سامنے آئی تھی۔

"وہ پیسہ آپ کو واپس ملے گا اور ضرور ملے گا۔ میں بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر سکتی ہوں لیکن تم جیسے دلال کے منہ پر جوتی بھی نہیں مار سکتی۔" کرن غصے سے بولی تھی۔۔۔

"شنکر سیٹھ جس کو ایک بار چاہتا ہے۔ اُس کو حاصل کر کے ہی رہتا ہے میری جان۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔۔۔ یا تو میرے بیس ہزار روپے لوٹا دو۔۔۔ یا۔"

"بیس ہزار۔۔۔ مگر رمیش بھیا کا تو اتنا بڑا کاروبار نہیں چل رہا ہے۔" کرن حیران ہو کر پوچھ بیٹھی تھی۔

"اس کا کاروبار ہی کون سا چل رہا ہے۔ تمہارے بھائی نے وہ سارا روپیہ شراب اور عیش کی نذر کر دیا۔" شنکر نے مکاری سے ہنس کر کہا تھا۔۔۔ اور کرن سُنتی ہی رہ گئی تھی۔۔۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں ہی جیسے رُک گئی تھیں۔

"بھیا۔۔۔ یہ سب کیا سُن رہی ہوں میں۔۔۔ کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے۔"

"نہیں کرن۔ یہ جھوٹ نہیں۔ سچ ہے۔ بالکل سچ۔" رمیش نے سر نیچا کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"لیکن تو نے پھر شراب پی۔ تم نے بُوا کو دیا ہوا وچن توڑ ڈالا۔"

"میں جانتی تھی بیٹی۔۔۔ وہ بدل نہیں سکتا۔" بُوا نے داخل ہوتے ہوئے کہا تھا اور پھر کرن اُسے لپٹ گئی تھی۔۔۔

"مجھے اِن باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تم کو ایک دن کی مہلت دیتا ہوں رمیش۔ کل صبح ہاں یا نا میں جواب ملنا چاہیئے۔ ورنہ میں۔" شنکر کی بات کو بُوا نے کاٹ دیا۔ اور پھر شنکر سیٹھ سے گرج کر بولی تھی۔۔۔ "شنکر سیٹھ۔ تم کل تک بے چین رہو گے نا۔ تو میں اسی وقت جواب دیئے دیتی ہوں۔۔۔ رمیش کو شراب پینے کی عادت پھر سے ڈالنے والے تم ہو۔ رمیش کو تم نے اپنی ہی مرضی سے روپیہ دیا تھا۔ اور تم نے

ہی برباد بھی کرایا۔ اور ـــ اب تم رمیش سے ہی پیسہ وصول کر لو۔ کرن کا تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا نام دوبارہ لیا تو زبان کاٹ دوں گی۔"

"بوا۔" رمیش نے چلا کر کہا۔

"مر گئی بوا تیرے لئے۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی مجھے اس دنیا سے چلا جانا چاہیئے تھا۔ تو اپنی بہن کا نیلام کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر میں شنکر بابو کو زبان دے چکا ہوں۔" رمیش نے غصّے سے کہا تھا۔ اور شنکر سیٹھ زہر خند لہجہ میں بولا تھا۔" اور شنکر سیٹھ وہ وعدہ بھی اب خود ہی پورا کرے گا۔" پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلا گیا تھا۔

رمیش نے بوا کی اور خونخوار نظروں سے گھورا تھا اور پھر کہا تھا۔

"یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا بوا۔"

"تجھے شرم آنی چاہیئے رمیش۔ کاش تم انسان بن سکتے۔ جس بہن نے تمہیں راکھی باندھی ہے۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر اسی کا سودا کرنا چاہتے ہو۔ تم انسان نہیں راکشس ہو۔ ـــ ذرا اس کو بھی تو دیکھو اس نے اپنی ماں اور بہن کی خاطر اپنے سارے ارمان کچل ڈالے اور کسی انجانی منزل کی اور چل پڑا ہے۔ لعنت ہے تم جیسے بھائی پر۔ کل کی دنیا تم پر تھوکے گی رمیش۔"

"بوا۔" رمیش حلق پھاڑ کر چلایا تھا۔" بند کر یہ بکواس۔ جب دیکھو اس کتّے کی تعریف کرتی رہتی ہو تم دونوں ـــ میں جان گیا ہوں اس کا جادو تم دونوں پر چل نکلا ہے۔ مگر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں ـــ میں اس کی دنیا ویران کر دوں گا۔ اس نے میری نیند حرام کر رکھی ہے ـــ میرے سامنے اس کی تعریف تم کرتی رہتی ہو۔ میرے سینے میں آگ سلگ رہی ہے۔ نفرت کی آگ ـــ بچپن سے لے کر آج تک وہ نفرت میرے سینے میں پل رہی ہے۔ میں اس کو کچا چبا جاؤں گا۔" رمیش کا

چہرہ غصّے کی شدّت سے لال ہو گیا تھا۔

"ایسا تو کبھی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔" کرن نے بولا تھا۔

"تجھے تو صرف شنکر سیٹھ کی رانی بننا ہے کرن۔ اور وہ کام صرف رمیش کر کے دکھائے گا" وہ شیطان کی طرح ہنس کر بولا تھا۔

"یہ تمہارا وہم ہے رمیش ___ میں اسی وقت کرن کو اپنے ساتھ لیجاؤں گی۔ اب ہم دونوں ایک پل بھی یہاں نہیں رہ سکتے۔"

"تم کون ہوتی ہو کرن کا خیال رکھنے والی۔ میں اس کا بھائی ہوں۔ تم اس گھر کی نوکرانی ہو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

بوا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

"میں جانتی تھی تم ایک دن مجھے ضرور یہی کہو گے۔ اپنے پلائے ہوئے دودھ کا صلہ یہی دو گے۔ لیکن چاہے تم کچھ بھی ہو ___ پھر بھی میں تم سے ہزار درجہ اچھی ہوں ___ چل بیٹی چل" بوا نے کرن کو ہاتھ سے تھام کر لیجانا چاہا لیکن تبھی رمیش اُسے اُس کے بیچ چٹان کی طرح کھڑا ہو گیا اور پھر ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ سے پھوٹ پڑا تھا ___ اور پھر اس کا ہاتھ چل نکلا اور بوا کے گال پر کئی تھپڑ پڑتے گئے ___ کرن چلاتی رہی تھی ___ روتی رہی تھی ___ گڑگڑاتی رہی تھی ___ "مت مارو" میری بوا کو مت مارو ___ یہ بڑا پاپ کر رہے ہو۔ مت مارو" لیکن رمیش پر تو جیسے خون سا سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے بوڑھی بوا کو تب تک نہیں چھوڑا جب تک کہ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر نہ گر پڑی تھی ___ پھر اُس نے کرن کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لا کر فرش پر پٹخ دیا تھا اور باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا تھا ___ اُس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اور وہ بڑبڑایا تھا۔

——" اب دیکھتا ہوں — کیسے تو میرا فیصلہ منظور نہیں کرتی "——

اور پھر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر گیا اور چل دیا تھا —— اور بوڑھی بُوا — جس نے کہ رمیش کو اپنے بچّے سے بھی زیادہ پیار اور دُلار دیا تھا فرش پر خون میں لتھ پت بے ہوش پڑی رہی تھی —

جنگ بندی لائن کے اس طرف ہزاروں سر فروش سپاہی قدم سے قدم ملاتے پریڈ کر رہے تھے ۔۔ اور دیپک ۔ وہ بھی جوش میں بھرا ہوا قدم سے قدم ملائے جا رہا تھا ۔ بھرتی ہونے والے جوانوں کو کچھ ہی دنوں میں لڑائی کی تربیت دی گئی تھی ۔ اُنھیں دُشمن کے ساتھ لڑنے کے ڈھنگ ۔ بندوق اور مشین گن چلانا بھی سکھلایا گیا تھا ۔ اور پھر اُس دن جب وہ سب پریڈ کر رہے تھے ۔ اچانک اُن کے کمانڈنگ آفیسر کو اطلاع آ گئی تھی کہ آگے والی چوکی پر دشمن نے زبردست حملہ کر دیا تھا اور دشمن تعداد میں زیادہ تھا ۔ کمانڈنگ آفیسر نے اُن کے پاس آ کر جوشیلے انداز میں اُن کو حکم دیا تھا ۔

" ہماری جتنی بھی فورس آگے نکل چکی ہے ۔ وہ اگلے مورچوں پہ ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہے لیکن خبر آئی ہے کہ دشمن تعداد میں زیادہ ہے اور حملہ زبردست ہو رہا ہے ۔ اس لیئے اِسی وقت تم سب کو آگے مارچ کرنا ہوگا ۔ اگرچہ ابھی تم کو بعد کی تربیت نہیں دی گئی ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم سب خود کو بہادر جان کر مورچوں پہ ڈٹے رہوگے جب تم میں وطن پرستی کا جذبہ موجود ہو ۔ تو تمہیں ہتھیاروں کی بھی ضرورت نہیں پڑیگی ۔

جاؤ اور اپنی ماتر بھومی۔ ماں کی رکھشا کے لئے اپنی جان دینے سے کبھی گریز نہ کرنا تم شہید ہو کر امر کہلاؤ گے۔ وطن کو تم پر ناز ہوگا۔"

"دو میل آگے چل کر تمہیں تمہاری منزل ملے گی۔ وہاں تمہیں میجر کماد ملیں گے جو وہاں اِس وقت کمانڈ کر رہے ہیں۔ جاؤ اور ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ بھگوان ہم کو ضرور کامیابی دیں گے کیونکہ ہم سب سچائی پر ہیں۔"

سب نے ایک ساتھ کمانڈنگ آفیسر کو سلامی دی اور آگے بڑھنے لگے۔ ایک ہی قدم ملاتے۔ سینہ تان کر وہ بہادر سرفروش ایسے چل رہے تھے جیسے وہ چٹانوں کو بھی توڑنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ لگ رہا تھا کہ دشمن اُن کے آگے زیادہ دیر ٹک نہیں سکے گا۔

سُندری ماں کئی دن سے بستر پر پڑی تھی۔ جب سے دیپک گیا تھا۔ وہ بیمار تھی۔ اور بیماری بھی شاید دیپک کی جُدائی تھی۔ اُسے وہی ایک غم تھا اور جمنا بیچاری پریشان سی اُس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جونہی سُندری کی آنکھیں کھلیں اُس نے جمنا کو دیکھا جو کہ اُس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی سوجھ گئی تھیں۔ شاید روتے روتے۔ سُندری کا دل بھر آیا۔ اور وہ کمزور سی آواز میں بولی تھی۔ "بیٹی۔ جا سو جا۔ اب تو تھک گئی ہو گی۔ رات بھی زیادہ گزر چکی ہے۔"

"نہیں ماں۔ تم سوتی رہو۔ تم بیمار رہو ماں۔ کیا ہو گا۔"

"تو فکر نہ کر بیٹی۔ میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"کیسے ٹھیک ہو گی تو ماں۔ تجھے تو بھیا کے جانے کا غم کھائے جا رہا ہے۔"

"میری فکر چھوڑ بیٹی۔ دیکھ میری وجہ سے تو خود بیمار سی لگ رہی ہے۔ بیٹی۔ کرن کو کئی دن سے نہیں دیکھا۔ جانے وہ کیسی ہے۔" سُندری ماں غمگین لہجہ میں بولی تھی۔ "اُسے بھی تو دیپو کے جانے کا غم ہو گا بیٹی۔"

"ماں فکر مت کر۔ بھیّا گئے ہیں تو جلدی ہی واپس بھی آئیں گے۔"

"ہاں بیٹی۔ اُسے تو آنا ہی چاہیے۔ آخر ماں کی یاد۔ بہن کا پیار۔ اُسے واپس نہیں لائیں گے کیا۔"

"میں روز بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں ماں۔ بھیّا سکھی رہیں۔ اور خوشی خوشی گھر لوٹ آئیں۔" جمنا نے کہا تھا اور سُندری نے ایک سرد آہ چھوڑ کر جواب دیا تھا۔ "ہاں بیٹی۔ پربھو ہی تو اُس کا رکھوالا ہے۔ وہ تو بیچارہ دیش کی خاطر جان کی بازی لگانے گیا ہے۔ بھگوان اُسے سکھی رکھے۔" کہتے کہتے سُندری کی ماں کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"راؤ"

"جی"

"تمہارے سارے کام بگڑتے جارہے ہیں"۔ شنکر سیٹھ تلخی سے بولا تھا۔

"کتنے بگڑ جائیں گے سیٹھ جی۔ راؤ کسی بھی صورت میں زیادہ موقعہ نہیں دیا کرتا۔"

"میرے ایڈوانس کے بدلے تم نے کیا کام کیا۔ بولو۔"

"مجھے افسوس ہے۔ لیکن آپ حکم دیں تو کرن کو آج ہی آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔ اب تو وہ غریب بھی یہاں نہیں رہا۔"

"نہیں راؤ ــــ تم کام کو اور بھی بگاڑ کر رکھ دو گے ــــ اب وہ میری مٹھی میں ہے ــــ جب چاہوں اس کی ڈور کھینچ سکتا ہوں ــــ ہاں ایک دوسرا کام ہے جو تم کو خود کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ کام ذرا ٹیڑھا اور مشکل سا ہے اسے تم ہی انجام دے سکتے ہو۔ میں کسی دوسرے پہ بھروسہ نہیں کرسکتا۔"

"حکم کرو سیٹھ —— غلام خود حاضر ہے" راؤ نے پھر مسکہ لگا دیا تھا۔
"منڈی والا سرکاری گودام —— یہاں کا سب سے بڑا گودام ہے راؤ۔ صرف وہی گودام اب بچا ہے۔ اُس کا آج ہی خاک ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اپنا بزنس پھر سے گھاٹے میں چلے گا"
"ایسا ہی ہوگا شنکر سیٹھ —— تم بے فکر رہو —— آج منڈی والا گودام بھی خاک ہو کر رہے گا ——" راؤ خوفناک انداز میں مُسکرایا تھا۔

رمیش جو نہی شنکر سیٹھ کے سامنے مودبانہ کھڑا ہو گیا تھا۔ شنکر نے اُس کی اور دیکھ کر طنز سے پوچھا تھا" اب کیا لینے آئے ہو۔ پُرانا ادا نہیں کیا تو ادر لینے کی جرأت تم نے کیسی کی؟"

"نہیں۔ نہیں شنکر بابو۔ آپ غلط مت سوچیے۔ میں تو آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کی بے عزتی ہوئی۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ آپ بے فکر رہیئے کرن آپ کی ہے۔ صرف آپ کی۔ میں نے اُسے بند کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ جب آپ حکم دیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

شنکر سیٹھ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

"تم ایک بھائی ہو کر بھی یہ سب کر رہے ہو۔ مجھے حیرت ہے رمیش۔"

"آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں شنکر بابو۔ میں نے آپ سے وعدہ جو کیا تھا۔" رمیش بھونڈے سے انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

"تو دیر کس بات کی۔ اس رشتہ کو تھوڑا مضبوط بناؤ۔ تم جانتے نہیں رمیش میں کرن سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اُسے پھول کی طرح رکھوں گا۔ اور پھر اپنے

پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

"یہی سب کچھ سوچ کر تو یہ قدم اُٹھایا ہے میں نے شنکر بابو۔"

" تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو۔ آؤ گلے مل کر شکوے دور کر لیں۔ تم بھی تو اب میرے کچھ بن گئے ہو۔" شنکر سیٹھ نے ہنس کر کہا تھا اور پھر عیاری سے کام لے کر اُسے گلے لگا لیا تھا۔ اندر سنگھ ۔۔۔ وہ تو ہزار جان سے شنکر سیٹھ پر قربان ہو گیا تھا۔

" بس شنکر بابو بس۔ مان گیا۔ آپ کے دل میں کتنا پیار ہے۔ کتنی دیا ہے۔ میں تو آج ہی یہ نیک کام کر ڈالتا مگر پہلے اُس دیپک کے بچے سے بدلہ لینا ہے۔ اُس کی کھال اُتار دوں گا میں۔ مجھے صرف کچھ دنوں کی مہلت دیجئے۔"

" ٹھیک ہے۔" شنکر نے سرور میں آ کر کہا تھا۔" میں اس معاملے میں بھی تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ فکر مت کرو۔ مجھے بھی اُس سے اپنا حساب چکانا ہے۔" ۔۔۔ شنکر سیٹھ شیطانی قہقہہ مار کر بولا تھا۔

کرن اُس کمرے میں قید تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئی تھیں اور وہ پوری طرح سے نڈھال ہو چکی تھی۔ رمیش نے اُس کو کمرے میں قید کر رکھا تھا اور ساتھ ہی بھوکا پیاسا بھی رکھا تھا۔ وہ اُس پرندے کی طرح تڑپ رہی تھی جس کو کہ بند پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ سویرے سے اُسنے جانے باہر جانے کی کتنی بار کوشش کی تھی لیکن بے سود۔ کمرے سے باہر جانیکا اب صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ایک منزلہ اونچی کھڑکی سے نیچے کود جاتے۔ مگر کئی بار ایسا سوچ کر بھی اُس کی ہمت نہیں پڑی تھی اور رفتہ رفتہ اُس کا دل ڈوبنے لگا تھا اور وہ اپنی بےبسی پر خون کے آنسو بہاتی رہی تھی۔ اسی حالت میں کئی بار اُس نے اپنی ماں کو یاد کیا تھا اور کئی بار باپو سے فریاد بھی کی تھی لیکن بے سود۔ وہ تو دوسری دنیا میں تھے اِس دُنیا کی کیسے جان پاتے۔

دن ڈھل چکا تھا اور سورج نے اپنا چہرہ دُور پہاڑوں کی اوٹ میں چھُپا لیا تھا اور اُس طرف سرخ لالی جیسے بکھر گئی تھی۔ کرن کو لگا جیسے اسی طرح کی آگ اُس کے سارے وجود میں سُلگ رہی ہو۔ ایک بار پھر کرن اُداس نظروں سے

اپنے پتا رائے صاحب کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور پھر ایکا یک وہ منہ ڈھانپ کر پھر پھر اکر رو پڑی تھی ۔ وہ روتی رہی تھی ۔ پھر سسکتی ہوئی وہ پھر اپنے پتا جی کی تصویر سے فریاد کرنے لگی تھی " دیکھ لیا آپ نے پتا جی ۔ بھیا مجھے کس طرح تڑپا تڑپا کر مارے ڈال رہا ہے ۔ وہ کس طرح آپ کی بیٹی کا سودا کرنا چاہتا ہے ۔ بولئے پتا جی ۔ بھگوان کے لئے کچھ تو بولئے ۔ آپ خاموش کیوں ہیں ۔ اپنی بیٹی کو بچا لیجئے ۔ اپنی عزت کو نیلام ہونے سے روک لیجئے " ۔ وہ پھر رو پڑی تھی ۔ پھر اُس کے دماغ میں کئی خیالات آنے جانے لگے تھے ۔

رمیش تجھے شنکر کے ہاتھوں بیچ ڈالے گا ۔

وہ تیرا بھائی نہیں ۔ دشمن ہے ۔

شنکر جیسے وطن فروش اور خونی کی بیوی بن جاؤ گی !

" نہیں " کرن زور سے چلّا اٹھی تھی " میں مرجاؤں گی مگر اُس کے ارمان پورے نہیں ہوں گے " ۔

تُو کر بھی کیا سکتی ہے پگلی ۔ تو عورت ذات ہے ۔ عورت جنم سے ہی کمزور ہے ۔ کچھ نہیں کر سکتی ۔ ہتھیار ڈال دے ۔

" کبھی نہیں ۔ جیتے جی ہرگز نہیں ۔ میں عورت ہوں ۔ لیکن بُزدل نہیں ہوں ۔ میں وقت اور زمانے کے ساتھ لڑ سکتی ہوں ۔ میں دیپک کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی ۔ وہی میرے تن اور من کا مالک ہے " کرن زور زور سے بولی تھی ۔

— تو پھر بھاگ جا یہاں سے ۔ دیپک ہی تیری منزل ہے ۔

— بھاگ ۔ اُسی کی خاطر بھاگ ۔

— تجھے اپنے پیار کی قسم ۔ تو بزدل نہیں ہے ۔ سوچتی کیا ہے ۔ کھول کھڑکی کے دونو پٹ اور کود جا ۔

کرن کے دل سے آواز سی اُٹھی تھی اور تبھی وہ کسی مضبوط ارادے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی کے قریب چلی گئی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر اُس نے نیچے زمین کا جائزہ لیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ کانپ کر رہ گئی تھی لیکن پھر اُس کا دل پتھر کا سا ہو گیا تھا۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھ کر اُس نے ایک میلی سی ساڑھی تلاش کر لی تھی اور ایک میز کے ساتھ اُس کو باندھ لیا تھا۔ کئی بھاری بھاری چیزیں لاکر اُس نے میز پر رکھ دیں تھیں تاکہ میز اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ پھر وہ ساڑھی کا پلو تھام کر کھڑکی سے نیچے اُترنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ سرکنے لگی تھی۔ ایک لمحہ اُس کی آنکھوں میں ایک دم اندھیرا چھا گیا تھا اور اُسے لگا تھا کہ وہ گر جائے گی لیکن پھر وہ سنبھل گئی لیکن پھر بھی بھوک پیاس اور اُداسی نے اُسے نڈھال اور کمزور بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان سب باتوں نے اُسے بے حال کر دیا۔ اُس کے ہاتھوں سے ساڑھی کا پلّو چھوٹ گیا تھا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں چبھ گئی تھیں اور ہاتھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اِن سب باتوں نے کئی منٹ تک اُسے بےخود کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر تبھی وہ چونک کر کھڑی ہو گئی تھی اور اُس نے ایک اور بھاگنا شروع کیا تھا۔ اُس کی منزل دیپک کا گھر تھا اور وہ وہاں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔

راؤ وہ کام اُس دن اکیلے ہی کرنے جا رہا تھا۔ اُس کے مالک شنکر سیٹھ نے خاص وجہ سے راؤ کو ہی وہ کام پورا کرنے کے لئے سونپا تھا۔ حالانکہ آج تک وہ اپنے سارے کام کرایہ پر رکھے ہوئے غنڈوں سے ہی لیتا تھا۔۔۔ لیکن وہ کام ٹیڑھا بھی تھا اور مشکل بھی۔ ۔۔ منڈی والا گودام شہر کا سب سے بڑا گودام تھا۔ جس میں کہ بے شمار چاول کی بوریاں گندم۔ آٹے سے بھرے ہوئے ڈرم۔ مٹی کا تیل اور دیگر ضروری اشیائے زندگی کی چیزیں تھیں۔ اس میں کروڑوں روپیوں کی جائیداد تھی۔ اُن غریبوں کی روٹی تھی جو مشکل سے دو وقت کھا پاتے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ انھیں بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کا نوالہ برباد کرنے جا رہا تھا وہ۔۔۔ وہ غرور سے پھول گیا تھا یہ سوچ کر کہ سیٹھ نے اُسے واقعی خاص آدمی جانا ہے۔ تبھی اُسے ایسا ٹیڑھا کام سونپا ہے۔ اور کوئی یہ کام نہیں انجام دے سکتا۔ سوچ کر راؤ کا سینہ پھولنے لگا تھا اور اُس نے خود کو شہر کا سب سے بہادر آدمی تصوّر کر لیا تھا۔

شام کے دُھندلکے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ رات آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اور لوگ ضروری کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں کی راہ لے رہے تھے۔ دن میں راؤ کو

نہ کام پورا کرنے میں ضرور مشکل در پیش آتی۔ اسی لئے اُس نے رات کا وقت مقرر کیا تاکہ وہ آسانی سے لاکھوں لوگوں کا گلا گھونٹ سکے۔

راؤ بیدل ہی جا رہا تھا۔ اور اندر ہی اندر سوچتا بھی جا رہا تھا "یہ دنیا کتنی بیوقوف ہے ـــ اور یہ لوگ کتنے کم عقل۔ اور۔ یہ سرکار۔ یہ قانون۔ بالکل نکمے ہیں۔ بالکل کام چور اور بزدل ـــ ابھی کچھ دیر پہلے اناج سے بھرا ہوا گودام بھرا پڑا ہے اور ابھی کچھ دیر کے بعد یہ خاک ہو جائے گا۔ لاکھوں لوگ بھوک کا سامنا کریں گے۔ شہر میں اکال پڑے گا۔ لاشوں کے ڈھیر ہوں گے۔ بچوں کی روتی ہوئی آوازیں غریب لوگوں کی چیخ و پکار ـــ لیکن قانون ـــ اِس کو روکتا کیوں نہیں ـــ قانون میرے سامنے چٹان کی طرح کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا تاکہ میں وہ کام نہ کر سکوں۔ ہُنہ۔ قانون کہیں سو رہا ہوگا۔ ایک زبردست قہقہہ راؤ کے منہ سے پھوٹ پڑا تھا۔ کہاں ہے قانون؟ کہاں ہے سرکار؟ وہ سرکار جو اکال پڑنے پر بھوکوں کو اناج نہیں دیتا۔ بھوک سے بلکتے اور تڑپتے ہوتے بے کسوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی ـــ اور ـــ اور اگر قانون اور سرکار وہ سب کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو پھر کم از کم اپنا فرض ٹھیک طرح سے انجام کیوں نہیں دیتا تاکہ میری طرح کوئی اُن بھوکوں کی روٹی چھین نہ سکے"۔ راؤ نے پھر قہقہہ لگایا تھا۔

"اور یہ لوگ۔ یہ کم عقل لوگ۔ اِن کا دماغ کب بیدار ہوگا۔ کب انہیں ذہنی انقلاب آئے گا۔ کب وہ اپنی روٹی۔ اپنی جائیداد کی حفاظت خود کرنا سیکھیں گے۔ وہ سوچتے کیوں نہیں کہ اگر قانون اور سرکار کوئی کام پورا نہیں کر پاتے تو وہ خود اُسے پورا کرلیں یا قانون و سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔ وہ کیوں نہیں سوچتے کہ اُن کو اپنی روٹی۔ اپنی زندگی کی حفاظت خود کرنی ہے۔ وہ سب کچھ قانون اور سرکار پر ہی کیوں چھوڑتے ہیں"۔

ـــ راؤ جیسا بے رحم۔ خونی اور وطن دشمن آدمی ایسا سوچ رہا تھا۔

اور پھر کچھ قدم چلنے کے بعد اُسے وہ بلند و بالا عمارت نظر آئی تھی جو سرکاری گودام تھا۔ عمارت مضبوط تھی۔ اینٹ، لوہے اور لکڑی کی بنی ہوئی پختہ عمارت۔ اس کے اردگرد اونچی دیوار تھی جس کو پھلانگنا راؤ کے بس میں نہیں تھا۔ اس بات کو سوچ کر راؤ چھپتے چھپاتے عمارت کا داخلی دروازہ ڈھونڈھنے لگا تھا اور تھوڑی دیر میں اُس کی نظریں سلاخوں سے بنے ہوئے دروازے پر پڑی تھیں۔ گیٹ پر اُسے ایک گورکھا چوکیدار نظر آیا تھا جس کے کاندھے پر ایک بندوق بھی لٹک رہی تھی۔ لیکن شاید ہی وہ بندوق کبھی استعمال کی گئی ہو۔ راؤ سامنے ہی پڑے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

وقت گزرتا گیا اور راؤ اتنی دیر میں بہت کچھ سوچتا گیا۔ اپنی زندگی کے اچھے بُرے دن اُس کے دماغ میں آتے گئے اور وہ سوچتا رہا۔ اس وقفے میں اُس نے مین گیٹ کی اور کئی بار دیکھا تھا۔ چوکیدار اُس وقت بھی کھڑا تھا لیکن اب کچھ اُکتایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

راؤ نے گھڑی کی اور نظر ڈالی تھی۔ ٹھیک دس بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ اور آس پاس دور دور تک ویرانی تھی۔ سارا ماحول خاموش تھا اور دور دور تک سُنسان لگ رہا تھا۔ راؤ نے ایک جست لگائی اور زمین پر رینگنے لگا۔ رینگتے رینگتے ہی وہ عمارت کی اونچی دیوار سے جا لگا تھا۔ ایک نظر اُس نے دیوار پر اوپر تک ڈالی پھر مایوس ہو گیا۔ کچھ سوچتا رہا اور پھر دیوار کے ساتھ ہی ساتھ لگا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ رُخ مین گیٹ کی طرف ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ چوکیدار گورکھے کے بالکل پیچھے ایسے کھڑا تھا جیسے ڈس لینے کی تیاری کر رہا ہو۔ چوکیدار کسی آہٹ کو محسوس کر کے چونک پڑا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سے سنبھل پاتا راؤ نے اُسے اپنی مضبوط باہوں میں دبوچ لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اُس کو تھام کر دوسرے ہاتھ سے

اس کا منہ دباتا گیا وہ۔ چوکیدار آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں ڈالتا گیا اور پھر پوری طرح سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ راؤ نے اُسے گھسیٹ کر سامنے جھاڑی میں ڈال دیا اور ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہ تھی۔

مین گیٹ سے داخل ہو کر وہ عمارت کے آنگن میں رینگنے لگا تھا۔ اُس کی نظریں چاروں اور کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حالانکہ اُس جگہ اندھیرا تھا لیکن پھر بھی وہ ٹھیک طرح سے چل رہا تھا۔ سامنے ہی عمارت کا لمبا سا دالان تھا۔ راؤ کے پاؤں دالان پر پڑ کر رُک گئے۔ اُس نے لپکے سے دالان کے دونوں سروں پر نظر ڈالی۔ اور پھر ایک طرف چل پڑا۔ بے آواز جوتوں کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چلتے ہوئے بھی آگے پیچھے کی سُن گن لیتا رہا تھا۔ سامنے مُڑ کر وہ ایک لمبی راہداری میں داخل ہو گیا۔ اور چلتا رہا۔ راہداری کے خاتمہ پر وہ رُک گیا۔ اُس کے سامنے ہی وہ دروازہ تھا۔ جسے کہ گودام کا دروازہ کہا جاتا تھا۔

راؤ کے کان دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ اُسے اندر سے کسی کے خراٹوں کی آواز سُنائی دی اور وہ مُسکرا دیا۔ اُس کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ اندر اور کوئی چوکیدار یا منشی وغیرہ موجود تھا۔ اور نیند میں مست خراٹے مار رہا تھا۔ راؤ کا ہاتھ دروازے کے کُنڈے پر پڑا اور پھر وہ اُسے ٹٹولنے لگا تھا۔ دروازہ اندر سے مُقفّل تھا اور باہر سے کھولنا مشکل تھا۔ لیکن راؤ جیسے کیڑے کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا۔ ایسے ہزاروں تالے وہ کھول اور توڑ چکا تھا۔ اُس نے جیب سے چابیوں کا گُچھا نکالا اور پھر ایک چابی سوراخ میں لگا کر گھما دی۔ دروازے کا قفل نہیں کھلا تھا۔ اُس نے دوسری پھر تیسری لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ کئی چابیاں گھُما رہا تھا۔ اور پھر اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار اُبھر آئے تھے۔ لیکن تبھی وہ اُچھل سا پڑا تھا۔ اُسے لگا کہ قفل کھل گیا تھا۔ ایک چابی پوری گھوم گئی تھی۔ راؤ نے دروازے کا ہینڈل گھما دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دھیرے سے دروازہ کے پٹ کو اندر سرکا دیا اور پھر فوراً اندر داخل ہو گیا تھا۔ لیکن تبھی کوئی زور سے اُسے دبوچ بیٹھا تھا۔

راؤ ایک لمحہ کے لئے حواس کھو بیٹھا تھا لیکن جلد ہی سنبھل بھی گیا۔ اُس نے حملہ آور کو نیچے اوپر سے دھکیل کر زمین پر ٹپکا تھا۔ اور اُس نے اُسے اُٹھنے کا موقع ہی نہ دیا اور اُسے فرش پر گیند نا اُچھالا گیا تھا۔ اُس آدمی کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔

"کون ہو تم۔ کیا لینے آئے ہو۔ تم اندھیرے میں اِس طرح چوروں کی طرح کیوں داخل ہوتے ہو؟"

راؤ نے جواب میں شیطانی قہقہہ لگایا تھا۔

"میں اِس اناج کو تباہ و برباد کرنے آیا ہوں۔ میں ایک دانہ بھی بچنے نہیں دوں گا اِس شہر میں۔"

چوکیدار کانپ کر رہ گیا تھا۔ اور پھر راؤ کے سامنے گڑگڑایا تھا۔

"بھگوان کے لئے اسے مت لوٹو۔ یہ اُن بے کسوں کا خون ہے جو غریب کہلاتے ہیں۔ اِس پر ہزاروں لوگوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ جانے کتنے پیٹ بھوکے رہیں گے یا بابو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں ــــ اِسے تباہ مت کرو۔"

"ہٹ کمینے۔" راؤ نے اُسے ٹھوکر مارتے ہوئے غرّا کر کہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ قہقہے لگاتا جا رہا تھا۔

"میں ہزاروں کا تھوڑا ہی ذمہ دار ہوں۔ چاہے کوئی تڑپ تڑپ کر جان دے دے مجھے کیا لینا ہے۔"

"لیکن میں اِس امانت میں خیانت نہیں پڑنے دوں گا۔ میں اِس کا محافظ

ہوں۔"

"اور میں تم جیسے کتوں کو چٹکیوں میں قتل کر سکتا ہوں۔"

چوکیدار نے پھر موقعہ پا کر راؤ پر حملہ کر دیا تھا اور راؤ پر وحشیانہ انداز میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ اُسے دبوچ بیٹھا تھا۔ اور اس بار راؤ اُس کے حملے کو روک نہیں سکا تھا اور زمین پر سِسٹتا چلا گیا تھا۔ چوکیدار اُسے بُری طرح سے رگڑ رہا تھا۔ "تم اتنی آسانی سے ہزاروں غریبوں کا گلا نہیں گھونٹ سکتے ذلیل آدمی۔ میں تم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

راؤ کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش تھی۔ کچھ وقت کے لئے وہ بے بس ہو گیا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے اُسے موقعہ مل ہی گیا اور اُسی دم اُس کا چمکتا ہوا خنجر چوکیدار کے پیٹ میں گھستا چلا گیا تھا۔ ایک زبردست چیخ کے ساتھ وہ اپنا پیٹ تھام کر رہ گیا تھا۔ اور پھر فرش پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔ خون کے فوارے سارے فرش کو لال کر گئے تھے اور راؤ وہ شیطانی قہقہہ لگا رہا تھا۔ آخری سانسوں کے بیچ بھی وہ راؤ کے پاؤں پکڑ پکڑ کر اُسے گودام تباہ کرنے سے روک رہا تھا۔ "تم جو کرنے جا رہے ہو بھگوان تم سے اُس کا حساب ضرور لے گا۔ تم کسی دن تڑپ تڑپ کر جان دیدو گے۔" اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

راؤ نے اپنے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک دوگنی ہوتی گئی۔ اِس بہت ہی لمبے اور وسیع ہال نما گودام میں بے شمار یعنی ہزاروں کی تعداد میں بوریاں۔ ڈرم۔ ٹین بھرے پڑے تھے۔ اُس میں اُن بھوکوں کی روٹی تھی جو دن بھر خون پسینہ ایک کر کے شام کو اِسی گودام سے اپنے لئے دو وقت کا کھانا خرید لیتے تھے۔

راؤ کی خوشی بڑھتی گئی۔ وہ ہنسنے لگا۔ زور زور سے۔ وہ ناچنے لگا تھا۔

جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ اور ساتھ ہی بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔

"ہاہاہا۔ چاول۔ آٹا۔ گندم۔ کھانڈ۔ تیل۔ ہاہا۔ ہا۔ سب مٹ جائے گا۔ ختم ہو جائے گا۔ راکھ بن جائے گا۔ میں اس سب کو ختم کر دوں گا۔ ہاہاہا۔"

جیب سے لائٹر نکال کر اُس نے آگ کا شعلہ مٹی کے تیل سے لگا دیا اور پھر آناً فاناً آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ آگ بڑھتی گئی۔ تھوڑی دیر میں سارا گودام آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

اور تبھی ایک ایسی آواز راؤ کے کانوں سے ٹکرائی جس کو سُن کر وہ چونک پڑا۔ پولیس کی وِسل۔ یعنی پولیس عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ شاید آگ کی وجہ سے یا گیٹ والے گورکھے نے ہوش میں آ کر پولیس کو اطلاع دی تھی۔ راؤ کو دور سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سُنائی دیں۔ راؤ بدحواس ہو کر فرار ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا تھا۔ راستہ تو صرف ایک تھا اور وہ تھا وہی ایک دروازہ جو لمبی سی راہداری میں کھلتا تھا۔ راؤ نے دوڑیں چھلانگیں لگا دی تھیں اور دروازے تک آ گیا تھا۔ لیکن تبھی اُسے راہداری میں قدموں کی چاپ سُنائی دی تھی اور وہ اندر کود گیا۔ ساتھ ہی کسی خیال کے تحت اُس نے اندر سے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ اب قدموں کی آواز نزدیک تر ہوتی گئی اور پھر پوری طرح سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

راؤ خود کو پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیسے کرتا وہ آدمی جو زندگی بھر پولیس کو حقیر سمجھتا آ رہا ہو۔ خود کو کیسے پولیس کے حوالے کرتا۔

اب وہ بُری طرح سے بدحواس ہو گیا۔ اوپر سے آگ کے شعلے اُسے جھلسائے دے رہے تھے۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی اور بھاگنے کا راستہ کوئی نہ تھا۔ راؤ کی آنکھوں میں اضطراب جھانکنے لگا تھا۔ اور اب اُسے اپنے چاروں اطراف میں موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر قبل جو قہقہے اُس کے دل و دماغ سے پھوٹ رہے تھے اب وہ سرد پڑ چکے تھے۔ اور اُسے لگ رہا تھا جیسے سارے گودام میں مُردہ چوکیدار کے قہقہے گونج اُٹھے ہوں۔

دروازہ زور سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ راؤ کو لگا کہ اب دروازہ ٹوٹنے ہی والا ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں رُک سی گئی تھیں۔ آگ زور پکڑ چکی تھی اور اناج کی بوریاں جل رہی تھیں۔

دفعتاً دروازہ کھٹکھٹانا بند ہو گیا تھا اور پھر دوڑتے قدموں کی آواز دُور ہوتی سُنائی دی تھی۔ کوئی چیخ رہا تھا "آگ پوری طرح پھیل چکی ہے اب باہر بھاگ چلو۔"

راؤ ایک منٹ کے لئے پھر سے زندگی پا گیا تھا اور اُس کے بدن میں خون کی گردشیں پھر سے چالو ہو گئی تھیں۔ اِس ارادہ سے کہ وہ اب دروازہ کھول کر باہر بھاگ نکلے گا وہ اپنی جگہ سے ہلا ہی تھا کہ اوپر والی چھت سے جلتا ہوا لکڑی کا بھٹا ٹوٹ کر اُس کے کندھے پر گر پڑا۔ ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ اُوندھے مُنہ فرش پر گر پڑا تھا اُس کے منہ سے تیز تیز چیخیں نکل رہی تھیں۔ اُس کا داہنا کندھا پورا جھلس گیا تھا۔ وہ مشکل سے اپنی جگہ سے ہل سکا لیکن اُوپر والے کو آج اُس سے پورا حساب لینا تھا۔ تبھی ایک بڑی سی شہتیر راؤ کو اپنے نیچے دبوچ بیٹھی اور وہ زبردست چیخ کے ساتھ فرش پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا خون جم گیا ہو اور گوشت بُھنا جا رہا ہو۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور وہ فرش پر زور زور سے ہاتھ پاؤں ٹیک رہا تھا۔ وہ راؤ جس نے ہمیشہ اپنے عیش کے لئے۔ آرام کی خاطر دوسروں کو تڑپا کر مار ڈالا تھا۔ ایک کتّے سے بھی بدتر موت مر رہا تھا۔ اُسے بچانے کے لئے کوئی نہ تھا۔ شنکر سیٹھ بھی نہیں۔ اُس کے اپنے ماتحت غنڈے بھی نہیں

اور اُس کے ردِ عمل بھی نہیں۔ یہ موت اُس کی اپنی بُلائی ہوئی موت تھی۔ اپنی موت کے لئے وہ خود ہی ذمّہ دار تھا۔

یہی انجام ہونا ہے اُن وطن دشمن غدّاروں کا۔ اُن مجرموں کا۔ جو دوسروں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے اور اپنی زندگی کو عیش و آرام سے کاٹنے کی خاطر دوسروں کی زندگی کو ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔

یہی انجام راؤ کا بھی ہو رہا تھا۔ وہ دردناک موت مر رہا تھا۔ تڑپ تڑپ کر، سسک سسک کر اُس کی جان نکل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی سارا گودام راکھ بن چکا تھا اور ہزاروں لوگ رو رو کر اپنی غریبی۔ بے بسی اور بھوک کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ رو رہے تھے اپنی بدنصیبی پر۔ اُن کی زندگی کا خزانہ آج لُٹ چکا تھا۔ اور وہ سب بے آسرا ہو چکے تھے۔

رمیش نے شنکر سیٹھ کی اور مسکرا کر دیکھا اور دروازے میں لگے قفل میں چابی گھما دی تھی۔ شنکر سیٹھ نے اُس کی مسکراہٹ کا ہنس کر جواب دیا تھا۔ وہ آج بہت خوش تھا کہ اُس کی چال کامیاب ہو چکی تھی اور اُس نے رمیش کو اپنے ظالم پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

دروازے کو دھکّہ دے کر رمیش اور شنکر لال اندر داخل ہوئے تھے اور پھر دونوں ٹھٹھک کر رُک گئے۔ کمرہ خالی پڑا تھا اور کرن وہاں سے غائب تھی۔ رمیش کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں اور وہ بدحواس سا ہو گیا۔ اُس نے اپنی نظریں کمرے کے چاروں اور ڈال دیں لیکن بے سود۔ وہ نہیں تھی۔ اُس کا دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ اچانک رمیش کی نظریں کھڑکی کے پاس پڑی بڑی سی میز پر پڑیں اور وہ لپک کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ میز کے ساتھ باندھی ہوئی ساڑھی ابھی تک کھڑکی میں لٹک رہی تھی۔

شنکر سیٹھ کا موڈ خراب ہو چلا تھا۔ اُس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے سے بیزاری کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ غرّاتے ہوئے لہجہ میں رمیش سے بولا تھا "کیوں چُپ کیوں ہو گئے۔ کہاں ہے تمہاری بہن"۔

"نہیں نہیں شنکر بابو۔ آپ غلط مت سوچئے" رمیش اُس کے دونوں ہاتھ تھامتا ہوا بولا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہوگی۔"

"تو جلدی سے ٹھکانہ کیوں نہیں بتا دیتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہم ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں" شنکر نے بیتابی سے پوچھا تھا۔

"دیپک کے گھر۔ چلئے شنکر بابو۔ آج آخری فیصلہ ہوگا۔ اب تو اُس کی جھونپڑی راکھ ہی بن جائے گی" رمیش خوفناک انداز میں بولا تھا۔ اور پھر وہ دونوں جھپٹ کر باہر چلے گئے تھے۔

کرن ہانپتی ہوئی سی دیپک کے گھر میں داخل ہوئی تھی اور جمنا نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا تھا۔ کرن کے ماتھے اور ہاتھ سے خون بہہ نکلا تھا۔ جمنا چونک پڑی تھی۔

"دیدی! خون۔ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا۔" جمنا پریشان سی ہو اُٹھی تھی۔

"اس کی فکر مت کر جمنا۔ بھیّا کا لگایا ہوا ٹیکہ ہے ۔ یہ بتاؤ کہ ماں جی کی طبیعت اب کیسی ہے۔" وہ ہانپتی ہوئی پوچھ بیٹھی تھی۔

"کچھ ٹھیک نہیں۔ بخار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اب کچھ بھی تو نہیں سوجھ پاتا۔ کاش آج بھیّا یہاں ہوتے۔"

سُندری ماں بستر پر پڑی بخار کی شدّت سے بیہوش ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں ویران سی لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو چکے تھے اور وہ زرد ہو چلی تھی۔ کرن نے سُندری ماں کا ماتھا چھو کر دیکھا۔ اُس کے ہاتھوں نے سخت گرمی کو محسوس کیا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور جمنا سے بولی تھی ـــ "اری جمنا کسی ڈاکٹر کو بلایا ہوتا۔ ماں جی کو تیز بخار ہو رہا ہے۔"

سُندری ماں نے ایک کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیں اور کمزور سی آواز میں بولی۔

"فکر مت کر بیٹی۔ میں ٹھیک ہوں۔ تو بول کیسی ہے" پھر اُس کے ماتھے اور ہاتھ پر نظر پڑتے ہی وہ دھک سے رہ گئی تھی "خون ۔۔۔ ارے تیرے ماتھے سے تو خون بہہ نکلا ہے۔ یہ کس طرح ہوا بیٹی" سُندری کی آواز بھر آگئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ کیسی حالت ہو گئی ہے تیری۔ بیٹی۔ تجھے دیکھ کر دیپو کی یاد بہت آتی ہے۔ جانے کہاں ہو گا" اتنا کہہ کر سُندری ماں نے سرد آہ بھری تھی۔ اور کرن اُسے تسلّی دینے رہی تھی "ماں جی۔ یہ کیا حوصلہ رکھیے۔ آپ کو تیز بخار ہے۔ آپ لیٹی رہیئے۔ چُپ چاپ ۔۔۔ میں کسی ڈاکٹر کو ابھی بلا کر لاتی ہوں"

لیکن کرن کے بولنے کے ساتھ ہی رمیش اور شنکر سیٹھ داخل ہوئے تھے ۔۔۔ اور کرن ۔۔۔ وہ دونوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی۔ اُس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ کانپ اُٹھی تھی ۔۔۔ اُسے لگا تھا جیسے کہ موت اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُسکے دل کی دھڑکنیں رُک سی گئی تھیں اور اُس کی آنکھوں سے بدحواسی جھانک رہی تھی۔

رمیش کرن کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں گھورنے لگا تھا "تم کو اس گھر میں آنے کی ہمّت کیسے ہوئی۔ میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا" وہ غصّے کی شدّت سے کانپتا ہوا بولا تھا۔

"بھیّا" کرن بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی "تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ کیوں میرا نیلام کرنا چاہتے ہو۔ یہ گھر شریفوں کا ہے تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا"

"کمبخت بکواس بند کر۔ چل دیکھ شنکر بابو تیرا انتظار کر رہے ہیں" رمیش اُس سے بول اُٹھا تھا۔ کرن کا خون کھول اُٹھا تھا۔ اُس کے جی میں آیا کہ دوڑ کر بھائی کی گردن دبوچ بیٹھے۔ اُس کا مُنہ نوچ لے۔ جس مُنہ سے وہ ایسے گندے الفاظ نکال رہا تھا اور کرن کے دل میں نشتر چبھونے والے الفاظ بول رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ صرف بےبسی سے التجا کر بیٹھی تھی۔

" بھیا مت کہو ایسا۔ تمہیں پتا جی کی سوگندھ۔ مجھے اس ظالم کے ہاتھوں نہ بیچو مت سونپو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں " کرن رمیش کے پاؤں پکڑ کر پھر پھرا کر رو پڑی تھی۔ لیکن رمیش انسان کب تھا۔ وہ تو شیطان بن چکا تھا۔ اُس نے انسانیت کب کی بیچ ڈالی تھی اور وہ اِس وقت صرف ایک بدکردار شیطان ہی تھا۔ کیونکہ شیطان ہی گناہ کرتا ہے۔ گناہ کراتا ہے اور گناہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ اُس نے کرن پر ایک بھرپور تھپڑ جڑ دیا تھا۔

" میں تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گا کمینی۔ تو شنکر بابو جیسے دیوتا کے بارے میں ایسا کہتی ہے۔ چل تجھے گھر پر ہی ٹھیک کروں گا " کہتا ہوا رمیش اُسے گھسیٹ کر لیجانے لگا اور کرن رو پڑی تھی۔ جمنا ہکا بکا سی کھڑی دیکھتی رہی اور سُندری ماں۔ اُس کے برداشت کا بندھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بستر پر سے ہی بول اٹھی۔ کمزور آواز میں بڑی مشکل سے بول پائی تھی۔

" میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ یہ ظلم ہے۔ تم میرے جیتے جی اس کو نہیں بیچ سکتے رمیش "

" آخر بھکاری کی ماں ہو نہ۔ تم میں تمیز کہاں۔ میری بہن ہے۔ میں جس طرح چاہوں کر سکتا ہوں۔ رمیش اُسے گھورتا ہوا بولا تھا۔

" رمیش " سُندری اُٹھتی ہوئی بولی تھی۔ اور کرن۔ وہ دور سے ہی چلا پڑی تھی ۔۔۔ " نہیں ماں جی نہیں۔ آپ مت اُٹھیئے۔ آپ کو بخار ہے " اور جمنا بھی دوڑ کر اُسے اُٹھنے سے روکنے لگی تھی ۔" ماں کیا کر رہی ہو۔ تم بیمار ہو " لیکن سُندری ماں کے بیمار اور بخار سے تپتے ہوئے جسم میں اُس وقت نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اُس نے جمنا کو جھٹک دیا تھا۔ " ہٹ جاؤ جمنا۔ میں دیکھتی ہوں کہ یہ ظالم

دوندے عورتوں پر کیسے ہاتھ اُٹھاتے ہیں!" اتنا کہتے ہوئے اُس نے فرش پر پڑا ہوا ڈنڈا اُٹھا لیا تھا اور رمیش پر جھپٹ پڑی تھی۔ رمیش نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑا تھا اور غرّا کر بولا تھا" آج تمہاری شامت آئی ہے بڑھیا۔ میں اِس گھر سے پُرانا حساب چکانے آیا ہوں۔ اِس گھر کو راکھ بنا کر ہی چھوڑوں گا۔" پھر وہ سُندری کو جھٹکا دے کر شنکر سیٹھ سے بولا تھا" شنکر بابو آپ کرن کو بچا لیجئے۔ مجھے اِن دو ماں بیٹیوں سے اپنا حساب برابر کرنے دیجئے۔"

شنکر نے آگے جا کر کرن کی باہنہ پکڑ لی لیکن سُندری کی ماں پھر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بپھر کر بولی" بھگوان سے ڈرو ظالمو۔ عورتوں پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ چھوڑ دو کرن کو۔ میرے جیتے جی تم اِس کو نہیں لیجا سکتے۔" شنکر نے سُندری ماں کو زور کا دھکّہ دیا تھا اور وہ دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ رمیش نے آگے بڑھ کر اُسے پیٹنا شروع کیا تھا اور جمنا روتی ہی رہ گئی تھی۔ کرن نے ہاتھ جوڑ کر اُس سے التجا کی تھی" چھوڑ دو۔ ماں جی کو مت مارو۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" لیکن رمیش کا ہاتھ نہیں رُکا۔ وہ اُس بیمار بوڑھی عورت کو مارتا ہی گیا جب تک وہ بے ہوش ہو کر فرش پر نہ گر پڑی تھی۔ جمنا دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ شنکر سیٹھ کرن کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ رمیش نے آگے بڑھ کر کمرے کا پورا جائزہ لیا تھا اور پھر جیب سے ماچس نکال کر اُس نے ایک تیلی سُلگائی اور پھر ایک کپڑے میں آگ لگا کر اُسے چھت کی اور اُچھال دیا تھا۔ جمنا ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی تھی ـــــ اور رمیش نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا مت کرو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ بھگوان کے لئے ہمارا سنسار نہ جلاؤ۔ ہم کو بے موت مت مار ڈالو۔" جمنا روتی ہوئی فریاد کرنے لگی تھی اور پھر مدد

کے لئے چلّانے لگی تھی۔ لیکن تبھی رمیش نے اُس کا مُنہ بند کر دیا اور وہ چھٹپٹانے لگی تھی۔ زہر بھری سِسکی ہنس کر وہ بولا تھا۔

"چُپ رہو اور اپنی بربادی کا تماشہ دیکھتی جاؤ"۔ پھر وہ قہقہہ لگانے لگا تھا۔ شنکر سیٹھ کرن کو بیچ چکا تھا۔ اور جمنا بے بسی سے آنسو بہاتی رہی تھی۔

"کمینے چھوڑ مجھے"۔ دفعتاً جمنا رمیش کا ہاتھ مُنہ پر سے ہٹاتے ہوئے بولی تھی۔

"ذلیل۔ بدماش میرا بھیا تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا"۔

"وہ بھکاری"۔ رمیش ہنستا ہوا بولا تھا۔ "وہ تو کب کا مر کھپ گیا ہو گا میری جان۔ اب تو تم ہو اور میں" کہہ کر رمیش نے جمنا کو دوبارہ پکڑ لیا اور گھر کے چاروں اور آگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ چونکہ ان کا جھونپڑہ عام بستی سے الگ تھلگ تھا۔ اِس لئے فوری مدد کے لئے کوئی نہ آسکا تھا اور وہ دونوں شیطان اُن کا سنسار برباد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جمنا نے پھر ایک بار رمیش کے بازو میں دانت گڑا دیئے اور رمیش کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پھر جمنا ایک ہی جست میں سُندری ماں کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی اور اُس کے ماتھے سے ابھی تک خون جاری تھا اور سارا فرش لال ہو چکا تھا۔ جمنا نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا "ماں ہوش میں آؤ۔ دیکھو ہمارا آشیانہ جل رہا ہے۔ ظالموں نے ہم کو لُوٹ لیا ماں۔ لُوٹ لیا"۔ وہ بِلکتی ہوئی بولی تھی۔

بڑی مشکل سے سُندری نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں اور نظریں گھما کر اُس نے دیکھا اس کا عمر بھر کا بنایا ہوا سنوارا ہوا گھر جل رہا تھا۔ اُس کے ارمانوں کا خون ہو رہا تھا۔

"بیو نہیں آیا جمنا"۔ مشکل سے وہ بول پائی تھی۔ دھیمی آواز میں۔

"آئے گا ماں ضرور آئے گا"۔ جمنا بلکتی ہوئی بولی تھی۔

"اب کیا آئے گا۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو سب کچھ لُٹ چکا ہے"۔ وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اُس کی سانسوں کی رفتار گھٹتی گئی تھی اور پھر ایکبارگی لفظ "دیپک" اُس کی آتما سے نکلا تھا اور پھر اُس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں۔ اور جمنا "ماں" کہہ کر اُس کی لاش پر گر پڑی تھی اور پچھاڑ کر رو رہی تھی۔ اور رمیش کتنا بے رحم تھا وہ۔ وہ ہنس رہا تھا خوب زور زور سے۔ ان کی اس تباہی اور بربادی پر۔ پھر اُس کی آنکھوں میں شیطانی چمک اُبھر آئی اور آگے بڑھ کر اُس نے جمنا کو گھسیٹ کر اُٹھا لیا۔ جمنا چھٹپٹاتی رہی۔ فریاد کرتی رہی لیکن رمیش نے اُسے گھسیٹ کر جلتے ہوئے جھونپڑے سے باہر کھینچ لیا تھا۔ سارا گھر راکھ ہوتا جا رہا تھا اور تب دور سے کئی آدمیوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئی تھیں۔ لیکن بے سود ــ اب تو سب کچھ لُٹ چکا تھا کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا۔ اور دیپک کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔

"دیپک"

"یس سر"

"تم میرے پاس آؤ۔" میجر کمار نے اُسے دُور سے آواز دی تھی۔ وہ اس وقت جنگ بندی لائن کے اِس پار دُشمن کا مقابلہ ڈٹ کر کر رہے تھے۔ دو دن سے لگاتار وہ لڑتے آرہے تھے لیکن ابھی تک دُشمن کے حوصلے پست نہیں ہوتے تھے۔ اور حملہ برابر جاری تھا۔ میجر کمار جوانوں کو برابر حوصلہ دیتے رہے تھے۔

"شاباش حملہ جاری رکھو۔ گھبراؤ نہیں جیت ہماری ہوگی۔ تم سب بھارت کے سپوت ہو۔ جان دے کر بھی ماں کی عزّت رکھو۔" اور جوانوں کا خون جوش مارتا جا رہا تھا۔ وہ جان کی پرواہ نہ کر کے دُشمن پر برابر شد بد قسم کے حملے کر رہے تھے۔

"دیپک"

"جی میجر صاحب"

"تم بہادر ہونا۔" میجر کمار نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی میں جان جانے کی پرواہ نہیں کرتا۔"

"دیش پر خود کو قربان کر دو گے۔"

"ہنستے ہنستے میجر صاحب۔ یہ تو میری آرزو ہے۔"

"تو سنو۔ تم خاردار جھاڑیوں میں چھپ کر اوپر کی طرف رینگتے جاؤ۔ تمہارے پاس ہینڈ گرینیڈ بم موجود ہیں۔ تم میرے سگنل کا انتظار کرو۔ اس وقت حملہ سامنے سے ہو رہا ہے۔ دشمن پوری توجہ سے حملہ کر رہا ہے۔ اس جگہ سے لگ بھگ نصف میل اوپر چل کر تم دشمن پر بم برساؤ گے۔ دشمن کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ ہم کو حملہ کرنے میں آسانی ہو گی۔ یہ کام خطرے سے پُر ہے لیکن تم نڈر ہو مجھے امید ہے تم ڈرو گے نہیں۔ بس یہی ایک راستہ ہے اس وقت دشمن کو بیک کرانے کا۔" میجر کمار جوش میں بھرے ہوئے دیپک کو ہدایت دے رہے تھے اور دیپک خود اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

"میجر صاحب۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

پھر اس نے خاردار جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ کانٹے اس کے جسم میں چبھنے لگے تھے لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز ہو کر رینگتا گیا تھا۔ میجر کمار انتظار کرتے رہے اور پھر کچھ دیر بعد انھوں نے ایک ہوائی فائر کر کے دیپک کو سگنل دیا تھا اور تبھی دشمن پر اوپر سے بم برسنے شروع ہو گئے تھے۔ دشمن کی توجہ اس اور چلی گئی۔ میجر کمار نے حکم دیا تھا کہ حملہ شدید کر دو۔ جوان جوش میں آ کر شدید فائرنگ کرنے رہے۔ ایک طرف سے بم برسنے شروع ہو گئے تھے دوسری اور سے گولیاں۔ تھوڑی دیر بعد دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اور وہ پیچھے ہٹتے گئے تھے۔ جب تھوڑی دیر بعد۔ دیپک میجر کمار کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا تھا۔ میجر کمار اچھل پڑے تھے۔ دیپک کے بازو سے خون جاری تھا اور اسے وہاں گولی لگی تھی۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن تھا اور میجر کمار۔ وہ غور سے دیپک کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

میجر کمار نے دیپک کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"جیت ہماری ہوئی دیپک۔ اُس پوسٹ پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ دُشمن بہت پیچھے بھاگ نکلا۔"

دیپک ملٹری اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پڑا تھا۔ اُس کے بازو سے گولی نکال لی گئی تھی لیکن بازو پر بینڈیج باندھی گئی تھی۔ اور وہ ابھی کمزوری سا لگ رہا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں سر۔ بہت خوش۔" دیپک نے کہا تھا۔

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا دیپک۔ مجھے واقعی تم پر ناز ہے۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا سر۔ کاش دیش کے لئے میری خون کی ایک ایک بُوند گر جائے۔"

"تم جیسے ہی دیش کا نام اونچا کرتے ہیں بیٹے۔" میجر کمار نے شفقت سے دیپک کا ہاتھ چوم کر کہا تھا۔۔۔ تبھی کسی اور سپاہی نے ایک تار لا کر دیپک کو دیا تھا۔ وہ گھبرا کر بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تار کو پڑھا اُس نے اور پھر وہ چکرا گیا تھا۔ تار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ماں تم نہیں مر سکتیں" وہ بڑبڑا یا تھا۔ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

میجر کمار نے فرش پر پڑا ہوا تار اُٹھا کر پڑھا تھا اور پھر اُس کے دل کو ایک دھچکہ سا لگا۔ اُس نے دیپک کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے بولا "بیٹے حوصلہ رکھو۔ تمہاری ماں ایک دیوی تھیں جس نے تم جیسے بیٹے کو جنم دیا اور اُسے ماتر بھومی کی سیوا پر لگا دیا۔ وہ عظیم تھیں بیٹے اُن پر تمہیں ہمیشہ ناز ہو گا"۔

"مجھے جانا ہو گا میجر صاحب۔ میری معصوم بہن اکیلی رہ گئی ہے۔ جانے اُس کا کیا انجام ہوا ہو گا" وہ رو دیا تھا۔

میجر کمار اُسے تھپکی دیتا رہا، تسلّی دیتا رہا۔

"ہمت سے کام لو بیٹے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب جا کر کیا کرو گے۔ جانتے نہیں تم۔ اس وقت دیش کو تمہاری کتنی ضرورت ہے۔ تم اِس وقت یہاں سے نہیں جا سکتے"!

"میجر صاحب" دیپک روتا ہوا بولا تھا "دیکھئے یہ راکھی۔ میری غریب بہنا کی باندھی ہوئی راکھی۔ جو مجھے بلا رہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ تکلیف میں ہے میرا جانا بہت ضروری ہے۔ مجھے جانے دیجئے میجر صاحب۔ اِس راکھی کی خاطر"

"لیکن تم زخمی ہو۔ تمہارا بازو ٹھیک نہیں ہے۔ اِس حالت میں تمہیں کیسے جانے دوں گا"

"یہ زخم گہرا نہیں ہے سر۔ اِس زخم سے گہرا زخم اُسے لگا ہو گا میجر صاحب جو اِس بڑی دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہو گی۔ کوئی بھی تو نہیں اُس کا والی میرے سوا۔ میری پرواہ مت کیجئے سر بھگوان کے لئے مجھے جانے دیجئے۔ میں ماتر بھومی کی قسم کھاتا ہوں بس جلدی ہی پھر حاضر ہو جاؤں گا" وہ میجر کمار کے پاؤں پڑ گیا تھا۔

"آپ بھی تو دل رکھتے ہیں میجر صاحب۔ آپ کی بھی تو کوئی بہن ہو گی۔ ذرا سوچئے اُس کے دل پر ماں کے مرنے کا کتنا غم ہو گا" دیپو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

میجر کمار کے دل میں طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے تھام کر اُسے اُٹھایا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولے تھے۔

"میں تمھیں جانے سے نہیں روک سکتا بیٹے۔ میں تمھیں کیسے روک سکتا ہوں۔ مجھے تمہارا درد معلوم ہے۔ اس وقت تمہیں جانے کی اجازت دے کر میں خود مجرم بن رہا ہوں اور مجھے بڑے افسروں کے سامنے جواب دہ بھی ہونا پڑے گا۔ لیکن کوئی بات نہیں بیٹے۔ تم جاؤ۔۔۔ جاؤ تم"۔

"آپ دیوتا ہیں میجر صاحب"۔ دیپک اُن کے پیر چھوتا ہوا بولا تھا۔ اور میجر کمار شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھنے لگے تھے۔

شنکر سیٹھ نے ایک بار پھر رمیش کا گلاس بھر دیا تھا۔ اور پھر مسکرایا تھا۔

"تم نے میرے دل کی مُراد پوری کر دی ہے دوست۔ آج شنکر خوش ہے۔ تم لُوٹتے جاؤ جتنا چاہتے ہو۔"

رمیش نشے کے سرور میں بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا۔ اور کسی انجانے سرور کو تصوّر کر کے سسکاری بھرنے لگا تھا۔

"شنکر بابو۔ آپ کی بدولت مجھے بھی ایک پھول حاصل ہوا ہے۔ احسان تو آپ کا بھی مجھ پر ہے۔" رمیش بڑبڑایا تھا۔

"اوہ سمجھا۔ وہ لڑکی۔ رمیش واقعی وہ بڑی خوبصورت ہے۔"

"پھلجھڑی کہئے شنکر بابو۔"

"ہاں واقعی۔ میں سوچتا ہوں بھگوان نے دنیا کس ڈھنگ سے بنائی ہے۔ جہاں پھولوں کو کھلنا چاہیئے تھا۔ وہاں نہیں کھلتے۔ اور کھلتے بھی کہاں ہیں۔ جہاں ہم جیسے لوگ اُن کو مسل کر رکھ دیتے ہیں۔"

"پھول تو مسلنے کے لئے ہی ہوتا ہے شنکر بابو۔" رمیش نشے میں پھر بڑبڑایا تھا۔

"نہیں رمیش۔ پھول تو صرف دیکھنے اور سونگھنے کی چیز ہے۔ لیکن ہم جیسے لوگ اُسے پورا کھلنے بھی نہیں دیتے ہیں اور مسل کر رکھ دیتے ہیں۔ تبھی تو ۔۔۔ تو بھی کسی پھول کو مسلنے جا رہا ہے آج ۔۔۔ ٹھیک ہے دوست جاؤ۔ مزہ لوٹو۔ زندگی کا کیا بھروسہ" شنکر بھی نشے میں بڑبڑانے لگا تھا۔

رمیش نے شراب کا آدھا گلاس ہاتھ میں لیا اور لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کمرے میں داخل ہو رہا تھا جہاں اُس نے بیچاری غریب جمنا کو قید کر رکھا تھا۔

رمیش کو دیکھ کر جمنا سہم کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجھ گئی تھیں۔ اور چہرہ زرد ہو چلا تھا۔ وہ بے بسی سے رمیش کی اور دیکھتی رہ گئی تھی۔ جو لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔

"کیوں جانِ من۔ یہ اُداسی کیوں۔ میری جان مزے لُوٹنے کا یہی تو وقت ہے۔ لُوٹتی جاؤ رمیش کو میری رانی" وہ نشے میں دُھت بک رہا تھا۔ اور جمنا وہ اُسے صرف دیکھ رہی تھی۔ آنسو بھری لال لال بھیگی ہوئی آنکھوں سے۔

رمیش نے جب جمنا کی اور سے کوئی جواب نہ پایا تو وہ اُس کے اور نزدیک چلا آیا تھا۔ اور پھر اُس نے جمنا کا ہاتھ تھام کر اُسے ایک جھٹکا دیا تھا لیکن جمنا پہلے سے ہی اس بات کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے جھٹکے کا جواب جھٹکے سے ہی دیا اور فوراً اپنا ہاتھ آزاد کرا لیا۔

"یہ بے رُخی کب تک۔ کب تک تڑپاؤ گی میری جان۔ میری باہوں میں سمٹ کر آ جاؤ۔ آؤ کب سے تمہیں چاہتا ہوں۔"

جمنا نے نفرت سے اُس کے چہرے پر تھوک دیا تھا۔

"ذلیل کمینے۔ مجھے چھوتا مت۔ تم میری ماں کے قاتل ہو۔" ایک لمحے کے لئے رمیش کا

دماغ غصّے کی شدّت سے اُڑ گیا تھا لیکن پھر وہ سنبھل کر نرم لہجے میں بولا تھا۔

"نفرت کرتی ہو مجھ سے۔ ارے نفرت کیوں میری پیاری۔۔۔ نفرت چھوڑ کر پیار کرو۔ پیار۔۔۔ اب تو صرف رینش کی ہو کر رہے گی۔"

"تمہارے خواب کبھی پورے نہیں ہوں گے۔ بھیّا تم سے ضرور بدلہ لے گا۔"

جواب میں رینش کا زبردست قہقہہ گونجا تھا۔

"وہ۔۔۔ بھکاری۔۔۔ وہ اب نہیں آ سکتا میری جان۔۔۔ کبھی نہیں آ سکتا۔ وہ نوکیب کا مر گیا ہو گا۔۔۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں۔ صرف میں اور تم۔ اور کوئی بھی نہیں۔"

جمنا بے بسی سے رو پڑی تھی۔ کرتی بھی کیا۔

"بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو رینش بابو۔" جمنا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی تھی۔۔۔ "میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے اس طرح تڑپا تڑپا کر مت مارو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"ارے رانی۔ مر یں تیرے دُشمن۔" وہ نشے میں بہک گیا تھا۔

"میں تو تمہیں چومنا چاہتا ہوں۔۔۔ سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ میرے دل کو ٹھنڈک جو ملے گی۔"

اُس نے پھر جمنا کو جھپٹ کر پکڑ لیا۔ اور سینے سے لگا لینا چاہا تھا مگر جمنا نے اُسے زوردار دھکّہ دے کر پرے ہٹا دیا۔۔۔ اور رینش وہ تو نشے میں آ کر کیدڑ بن چکا تھا۔ دھڑام سے فرش پر گر پڑا تھا۔۔۔ اور جمنا کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر بولی تھی۔۔۔ "دُور رہو ظالم مجھ سے دُور رہو۔۔۔ تم جیتے جی مجھے نہیں پا سکتے۔" اور رینش بڑی مشکل سے فرش پر سے اُٹھ پایا تھا۔۔۔ وہ غصّے سے بھر گیا تھا

اور بڑبڑاتا ہوا بولا تھا —— "جاتا ہوں — مگر یاد رکھو۔ جلد ہی تم کو اپنا بنا کر چھوڑ دوں گا —— تجھے اب میرے ہاتھوں سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔"

اور پھر وہ دروازہ زور سے پٹک کر باہر نکل آیا تھا۔ اندر بیچاری معصوم حمنا روتی ہوئی رہ گئی تھی —

دیپک کے قدم اور تیز اُٹھنے لگے تھے۔ جُوں جُوں وہ گھر کے نزدیک پہنچ رہا تھا اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کے چاروں طرف کوئی پُکار رہا ہو۔۔۔ "مجھے بچاؤ۔ ظالم درندوں کے ہاتھوں مجھے بچاؤ"۔ اُس نے دل کو مضبوطی سے تھاما۔ اُسے لگا جیسے اُس کے دماغ کی رگیں ہی پھٹنے والی ہوں۔ اُس کی ٹانگوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ اتنا تیز چل رہا تھا۔۔۔ حالانکہ وہ کمزور بھی تھا اور کئی دن رات کام کرتا رہا تھا۔

روپ نگر کالونی کے خاتمے پر جہاں سیٹھ رگھو ناتھ رائے کرن ورمیش کے پتا کی کوٹھی تھی دیپک کے قدم ٹھٹھک کر رُک گئے۔ اسی عمارت کے دوسری طرف دیپک کا ایک منزلہ کوارٹر تھا لیکن اُس وقت دیپک کو وہاں راکھ کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ پاگلوں کی طرح اُس اور دیکھتا رہ گیا تھا۔ یکایک اُس کے وجود سے ایک کراہ آواز کے ساتھ نکلی۔

"ماں" اور وہ دو تین چھلانگوں میں ہی اُدھر تک پہنچ گیا۔ گھر نہیں تھا۔ ماں نہیں تھی۔ جمنا نہیں تھی۔ اور کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں۔ سوائے راکھ کے اور جلی ہوئی

ٹوٹی پھوٹی لکڑی کے۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں اور گھومنے لگا اور تانکنے لگا تھا۔ جیسے کہ وہ پاگل ہو گیا ہو۔ سچ مچ پاگل۔ اُس کا گھر بار کب کا لُٹ چکا تھا اور اُس نے بہت دیر کر دی تھی۔

اُسے لگا جیسے اُس کے بدن میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔ وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا۔۔۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

"ماں۔ میری ماں۔ یہ کیا ہو گیا" وہ بڑبڑا اُٹھا تھا "کس نے میری دنیا اُجاڑ کر رکھ دی"۔ تبھی کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ رامو کاکا تھا۔ اِسی کالونی میں رہنے والا ایک آدمی۔ اُس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

"یہ سب کیا ہوگا رامو کاکا۔ کس نے میرا گھر جلا ڈالا۔ میرا سب کچھ لوٹ لیا" وہ رامو کاکا کے سینے سے لگا ہوا ہچکیاں بھرنے لگا تھا۔

"تم نے دیر کر دی دیپک۔ کسی نے تمہارا سب کچھ لوٹ لیا۔ گھر بار جلا کر خاک کر دیا۔ ماں جی کا تو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ اور جمنا بھی غائب کر دی گئی۔ اُس دن ماں جی سخت بیمار تھیں دیپو۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے جلتے ہوئے مکان سے چتا کا بھی کام لیا ہے۔ ہم بھی دیر سے پہنچے تھے۔ اُس وقت سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ بھی درج کرائی تھی۔ مگر ابھی تک جمنا بٹیا کا کچھ بھی پتہ نہ چلا"۔

رامو کاکا کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ اور دیپک وہیں راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا روتا رہا۔ اُسے لگا جیسے وہ راکھ اُس کی ماں کی ہو جو اُس سے چلّا چلّا کر کہہ رہی ہو "دنیا کے ظالم ہاتھوں سے تم مجھے نہیں بچا سکے۔ اب اپنی بہن کو تو بچا لو دیپک۔ وہ بیچاری تڑپ رہی ہوگی"۔

یکایک دیپک کسی فوری خیال کے تحت کھڑا ہو گیا تھا۔۔۔ اور اُس کی آنکھیں سُرخ انگارے ہو گئی تھیں۔۔۔ وہ بڑبڑا اُٹھا

تھا ـــــ "میں اُن سے ضرور بدلہ لوں گا ــــــ میں تیرا اپمان برداشت نہیں کرسکتا ماں ــــــ میں اُن سے ضرور حساب لوں گا" ـــــ اور پھر نہ کھڑا ہو کر ایک طرف بھاگتا چلا گیا تھا ـــــ راموکاکا اُسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا تھا۔

جمنا سویرے سے ہی اُداس تھی۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوجھ گئی تھیں۔ اور وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اب وہ اپنی عزت ظالم رمیش کے ہاتھوں زیادہ دیر بچا نہیں سکے گی۔ اُس نے کئی بار چاہا کہ اپنی زندگی ختم کر دے لیکن رمیش نے اُس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ وہ نہ مر سکتی تھی اور نہ بھاگ سکتی تھی۔ اُس نے دل سے دیپک۔ اپنے بھائی کو بہت یاد کیا لیکن اب وہ اُس اور سے بھی نا اُمید ہو چکی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو بھگوان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ آج تک رمیش نے کئی بار اُس کے ساتھ زبردستی کرنی چاہی تھی لیکن ہر بار وہ خود کو اُس کے ظالم پنجے سے بچاتی رہی تھی۔ لیکن آج رمیش نے آخری موقعہ دیا تھا اُسے سوچنے کا۔ بھلا وہ سوچ بھی کیا سکتی تھی۔

"کیا وہ اپنی عزت اپنی آبرو رمیش کی بھینٹ چڑھا دے"۔

"نہیں"۔ اُس کے دل سے آواز اُٹھتی۔ "تو دیپک کی بہن ہے۔ لڑتی جا"۔

جمنا اسی سوچ میں بیٹھی سسکی جا رہی تھی کہ رمیش دروازہ کھول کر داخل ہوا تھا آج اُس نے زیادہ نہیں پی تھی اور وہ لڑکھڑا بھی نہیں رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں

ہوس کی آگ سلگ رہی تھی اور وہ پورا شیطان سا لگ رہا تھا۔ جمنا کانپ کر رہ گئی تھی۔ رمیش نے بھونڈے پن سے اُس کی اور دیکھا اور کہا تھا۔

"تو رانی۔ کیا فیصلہ کیا تم نے۔ تم نے جینے کا فیصلہ ہی کر لیا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے ہر کوئی دنیا میں جینا ہی چاہتا ہے۔"

"نہیں۔" جمنا درد بھرے لہجہ میں بولی تھی۔ "مجھے جینے کی کوئی تمنا نہیں۔ مجھے مرنے دو۔ میں جینا نہیں چاہتی۔"

"میری جان۔ اگر مرنا ہی ہے تو بعد میں مر جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ میں بہت دنوں سے اس آگ میں سلگ رہا ہوں۔ اِس کو ٹھنڈا تو کر لوں پہلے۔" رمیش ہنس کر بولا تھا۔

"میں جیتے جی تم کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔ تم شیطان ہو، درندے ہو۔" جمنا گرج کر بولی تھی۔ اور رمیش جواب میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا۔ "رمیش جو کچھ چاہتا ہے حاصل کر کے ہی رہتا ہے اور آج میں تجھ سے سب کچھ حاصل کر کے ہی رہوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ جمنا کی اور بڑھنے لگا تھا اور جمنا سہم گئی تھی۔

"میرے قریب مت آؤ۔ تم خونی ہو۔ شیطان ہو۔ مجھے برباد مت کرو۔" وہ پیچھے ہٹتی ہوئی گڑگڑا کر بولی تھی لیکن وہ قہقہہ لگانے لگا تھا۔

رمیش آگے بڑھتا گیا تھا۔ پھر اُس نے ایک ہی جست میں جمنا کو دبوچ لیا تھا۔ بیچاری کئی دن سے بھوکی پیاسی تھی۔ غم نے اُس کو کمزور اور بے بس کر دیا تھا۔ اُس نے پورا زور صرف کیا لیکن آج رمیش وحشی بن گیا تھا۔۔۔ وہ چھوٹ نہ سکی۔ پھر بھی وہ جد و جہد کرتی رہی اور اسی جد و جہد میں اُس نے رمیش کے بازو کو کئی جگہ سے کاٹ کھایا۔ رمیش کی گرفت کچھ وقت کے لئے ڈھیلی پڑ گئی تھی لیکن پھر وہ درندہ بن گیا تھا۔ غصے سے اُس کی بُری حالت ہو گئی تھی۔ اُس نے جمنا کے گال، چہرہ پر

تھپیڑ مارنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ چیختی رہی۔ چلاتی رہی تھی لیکن اُسے رحم نہ آیا۔ جمنا کے چہرے سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا تھا۔ اور پھر آخری بچاؤ کے خیال سے وہ چلانے لگی تھی۔ "بچاؤ۔ کوئی بچاؤ۔ بچاؤ۔" لیکن رمیش ٹس سے مس تک نہ ہوا تھا۔ اُس نے ہنس کر کہا تھا۔

"اور چلاؤ۔ چیخو۔ لیکن یہاں تجھے بچانے کے لئے کوئی بھی نہ آنے کا۔ میری جان چُپ چاپ خود کو میرے حوالے کر دو۔" جمنا کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور تبھی رمیش نے آگے بڑھ کر ایک ہی جھپٹ میں اُس کو دبوچ لیا اور اُس کے کپڑے تار تار کر دیئے تھے۔ جمنا سر سے پاؤں تک لرز گئی تھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"تجھے تیری ماں کی قسم۔ مجھے مت لوٹو۔ میں دکھی ہوں۔ غریب ہوں۔ مجھے جان سے مار ڈالو مگر ایسی سزا نہ دو۔ میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ تیری بھی تو بہن ہے اُس کا ہی واسطہ۔" لیکن آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رمیش نے اُس کو بیدردی سے فرش پر تڑپنے دیا تھا۔ اور کچھ لمحوں کے لئے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اور رمیش شیطان بن چکا تھا بھگوان بھی دیکھ کر انجان بنا رہا اور انسان گنہگار بنتا گیا۔ بنتا گیا۔ دن کا اُجالا گھٹنے کے لئے بیتاب ہو اُٹھا تھا۔ رات تڑپ رہی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اندھیرا کر سکے تاکہ انسان کا اتنا بڑا گناہ اُبھر نہ جائے۔ جب جمنا کا ذہن تھوڑا سا لوٹ آیا تھا۔ ایک دل ہلا دینے والی چیخ رمیش کے بنگلے میں دور دور تک گونجتی چلی گئی تھی۔ پرندے تک ڈر کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور زمین تک کانپ گئی تھی۔ اور چاروں اور کائنات بھی رو اُٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی کو ذبح کیا گیا ہو۔ کسی کی آتما تڑپ کر چیخ اُٹھی تھی۔

رمیش ایک شیطان۔ انسانیت کے نام پر بدنما داغ۔ وہ پا چکا تھا وہ انمول موتی۔ وہ موتی جو عورت کا صرف ایک انمول گہنا ہوتا ہے۔ جس کو کھونے کے بعد

عورت عورت نہیں رہتی۔ کچھ بھی نہیں رہتی۔

غریب اور مظلوم جمنا لُٹ چکی تھی اور لُٹا کر بے سُدھ پڑی تھی۔ نہ آنسو تھے۔ اُس کی آنکھوں میں۔ نہ کوئی دُکھ تھا۔ نہ کوئی خوشی۔۔۔ بس ایک گوشت کا بنا ہوا وجود ہی تو تھا اور کچھ نہیں۔ لگتا تھا اُس میں زندگی کے آثار ہی نہ ہوں۔

رمیش قہقہہ لگا رہا تھا۔ اپنی جیت پر۔ فتح پر۔ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ ذلیل انسان خوش تھا کہ اُس نے اپنے دشمن دیپک کی بہن کی عزت لوٹ لی۔

جمنا کی نبض دھیمی چل رہی تھی اور رمیش کُرسی پر بیٹھا گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ اپنی کامرانی میں۔

دیپک وہ دل ہلا دینے والی چیخ سُنکر دہل گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ چیخ جمنا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دوڑتا رہا تھا دوڑتا رہا تھا۔ اُس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ اس وقت شنکر سیٹھ کے گھر سے ہی آ رہا تھا۔ اور وہاں کے نوکر سے اُس نے معلوم کر لیا تھا کہ جمنا کہاں پر ہے۔ اِسی خیال سے وہ رینش کے اِس بنگلے کی اور اُس نے بھاگنا شروع کیا تھا۔ اُس کے اندر ایک اُبال سا آ رہا تھا اور وہ جلد سے جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور پھر اس چھوٹی سی عمارت کے قریب پہنچ کر دیپک کے کانوں سے وہ چیخ ٹکرائی تھی اور وہ ٹھٹھک کر رُک گیا تھا۔ اُسے لگا تھا جیسے کسی نے اُس کا دل چھلنی کر دیا ہو۔

کسی بھی بات کی پرواہ کئے بغیر وہ کوٹھی کے اندر بھاگتا چلا گیا تھا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ سامنے ہی اُس کمرے کا دروازہ نظر آیا تھا اُس نے اور کسی بھی بات کو سوچے بغیر اُس نے دروازہ کو دو تین دھکوں سے ہی اُکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن وہیں پر اُس کے قدم

جم کر رہ گئے تھے۔ جمنا فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہ تھا اور اُس کے جسم سے جگہ جگہ خون رِس رہا تھا۔ دیپک کی آتما، اُس کا سارا وجود تڑپ اُٹھا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چلّایا تھا۔ "جمنا"۔ اُس کی آواز سُنکر دیش بھی تھرّا اُٹھا تھا۔

دیپک نے ایک طرف پڑی ساڑھی کو اُس پر ڈال دیا اور پھر جمنا کا سر گود میں لے کر رو پڑا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔۔۔ اپنی قسمت پر وہ رو دیا تھا۔ ایک ہی چیز باقی بچی تھی اور وہ تھی بہن کی عزّت۔۔۔ لیکن دیپک اُس کو بھی بچا نہ سکا تھا۔ اور دیش کی راہ میں اُس کا سب کچھ لُٹ گیا تھا۔ اُس کی حالت اُس جواری جیسی تھی جس کا سب کچھ لُٹ چکا ہو۔ لیکن اُس نے سب کچھ تو لُٹا دیا تھا لیکن اپنی ماتر بھومی۔ اپنے دیش کے لئے۔۔۔

جمنا کی سانسیں اُکھڑ چکی تھیں۔ دیپک اُس کے ماتھے کو چومتا ہوا آوازیں دیتا رہا تھا۔

"جمنا میری بہن۔ آنکھیں کھولو۔ میں آگیا ہوں۔ تمہارا بھائی"۔ لیکن جمنا کی آنکھیں نہ کھلی تھیں۔ دیپک روتا ہوا پھر اُسے جھنجھوڑنے لگا تھا۔

"میری بہن کچھ تو بول۔ تیرا بھائی آیا ہے۔ اپنے بھائی کو تو ایک بار معاف کردے۔ میں تیری عزّت نہیں بچا سکا میری بہن۔ مجھے معاف کردے"۔ اور پھر جمنا کی آنکھیں کھل سکی تھیں بھیگی ہوئی آنکھیں جن میں زندگی کی کوئی آس باقی نہ تھی۔ اُس نے دیپک کو ایک نظر سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایک مُردہ سی مسکراہٹ رینگ آئی۔۔۔ اُس نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ دیپک کی کلائی تک پہنچا دیا اور پھر اپنی باندھی ہوئی راکھی پر وہ ہاتھ مضبوطی سے ٹکا دیا۔ اور دوسرے ہی لمحہ اُس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کے ظلم سے آزاد

ہو چکی تھی۔ وہ غریب جمنا جس نے صرف دُکھ ہی دُکھ دیکھے۔ اُس کی ڈولی بن دُلہن کے اُٹھی تھی اور برات لوٹ گئی تھی۔ اُس کے سامنے ہی اُس کی ماں کو مارا گیا اور گھر بار خاک کر دیا گیا اور پھر رمیش نے اُس کی عزّت و آبرو بھی لوٹ لی تھی۔ وہ جمنا آج سب دُکھوں سے آزاد ہو چکی تھی اور دیپک "وہ جمنا" کہہ کر اس سے لپٹ گیا تھا۔ وہ بچّے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پھر اُس نے جمنا کا ماتھا چوم لیا اور اُس کا سر فرش پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھیں اُس نے پونچھ ڈالیں اور کھڑا ہو کر رمیش کی اور غور سے دیکھنے لگا۔

"مجھے معلوم نہ تھا۔ وہ اتنی کمزور دل کی ہو گی۔ ورنہ میں اتنی سختی نہ کرتا اُس پر۔" رمیش ڈھٹائی سے بولا تھا۔

دیپک رمیش کی اور بڑھتا گیا۔ لال لال آنکھوں میں انگارے لئے۔

"کمبخت، بے رحم، خونی۔ تو نے کتنے ظلم کئے مجھ پر۔ بچپن سے لے کر آج تک تو مجھے مارتا ہی آیا ہے۔ کاش تو کرن کا بھائی نہ ہوتا تو میں نے بہت پہلے تجھے سبق دیا ہوتا۔ میں آج تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

رمیش طنز سے مسکرایا تھا۔ "میں سمجھ گیا تھا تم مر گئے ہو۔"

"کیسے مر سکتا تھا۔ تم سے اپنا حساب پورا کئے بغیر ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تو میرے ہاتھوں سے ہی مارا جاتے۔" رمیش قہقہہ لگا کر بولا تھا۔ "یہ میری حسرت تھی۔"

اِس کے ساتھ ہی اُس نے چاقو نکال کر دیپک پر چھلانگ لگا دی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ رمیش دیپک پر چاقو سے وار کرنے کا موقعہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور دیپک اُس سے چاقو چھیننے کا موقعہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور تبھی دیپک کو موقعہ مل ہی گیا۔ اُس نے رمیش کی کلائی دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُس کے پیٹ

میں گھٹنے سے ٹھوکر مار دی۔ رمیش سنبھل نہیں سکا تھا چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دیپک نے اُس پر مکّوں کی بارش شروع کر دی تھی۔ رمیش نے دو تین چوٹیں کھانے کے بعد عقل سے کام لیا اور پوری طرح سنبھل گیا۔ ایک بار موقعہ پا کر اُس نے آتشدان سے جلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا لے کر دیپک پر حملہ کر دیا۔ دیپک پیچھے ہٹتا گیا۔ پیچھے کمرے کی دیوار تھی۔ رمیش نے اُس پر وار کرنا چاہا۔ دیپک تھوڑا جھک گیا۔ جلتی ہوئی لکڑی دیوار سے ٹکرائی۔ دیپک نے موقعہ پا کر اُس کی کلائی پھر تھام لی اور اُسے مروڑنے لگا۔ دھیرے دھیرے رمیش کی کلائی کمزور پڑتی گئی اور جلتی ہوئی لکڑی چھوٹ کر فرش پر۔ گر پڑی قالین پر جلتے ہوئے انگارے پھیل گئے تھے اور رفتہ رفتہ اُس میں آگ سُلگتی گئی۔

دیپک نے رمیش کو دبوچ لیا تھا۔ اور وہ اُسے پھر مار رہا تھا۔ ٹھوکروں سے مُکّوں سے۔ رمیش کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور اُس کے چہرے سے خون جاری ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے آگ سارے کمرے میں پھیلتی چلی گئی اور شعلے بھڑکنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ دونوں بوکھلا گئے تھے اور اسی بوکھلاہٹ میں اچانک رمیش کے ہاتھ میں چاقو آ گیا تھا۔ اُس نے وحشی انداز میں دیپک پر چھلانگ لگا دی۔ اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر دیپک کو سنبھل جانے میں ہو گئی ہوتی تو چاقو اُس کے سینے میں اُتر گیا ہوتا۔ جھکائی دے کر دیپک نے ایک بار پھر رمیش کی کلائی کو تھام کر دبا دیا لیکن رمیش نے درد محسوس کر کے بھی چاقو نہ چھوڑا۔ دونوں آپس میں پھر سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ رمیش چاقو دیپک کے سینے میں اُتارنا چاہتا تھا اور دیپک رمیش سے چاقو چھیننا چاہتا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ دونوں فرش پر لڑھکتے ہوئے چلے گئے کبھی رمیش اوپر آتا اور کبھی دیپک۔ دونوں وحشی انداز میں لڑ رہے تھے اور زندگی اور موت سے کشمکش کر رہے تھے۔ رمیش نے موقعہ پا کر دیپک کے سینے میں چاقو اُتار دینا چاہا۔ لیکن اچانک ہی دیپک نے اُس کی

کلائی کا رُخ موڑ دیا اور چاقو کا وار اُلٹا ہو کر رمیش پر چل نکلا اور رمیش ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چاقو اُس کے پیٹ میں گہرائی تک داخل ہوا تھا اور اُس کے چہرے پر اذیت و کرب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ چند لمحہ تک وہ پیٹ پکڑے رہا اور پھر دھڑام سے فرش پر گر پڑا تھا ___

آگ کے شعلے زور پکڑنے لگے تھے۔ دیپک غور سے رمیش کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا کہ اُسی وقت انسپکٹر گپتا چند سپاہیوں کے ہمراہ داخل ہوتے۔ دیپک چونک کر اُنہیں دیکھنے لگا تھا۔ دیپک انسپکٹر گپتا کے سامنے گڑگڑایا تھا۔" انسپکٹر صاحب۔ یہ خود اپنے ہی وار سے مر گیا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اِس نے میری بہن کی عزّت لوٹ لی ہے اور اُسے مرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے اس کو اس کی سزا دینی چاہی لیکن اس نے چاقو نکال کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ لیکن مجھ پر حملہ کرتے ہوئے وہ خود ہی ختم ہو گیا۔ ذلیل درندہ۔ شیطان۔" دیپک نے اُس کی لاش پر تھوک دیا تھا۔

" حوالدار، گرفتار کر لو۔" انسپکٹر نے ایک حوالدار کو حکم دیا تھا۔

" لیکن میں بے قصور ہوں۔" دیپک پھر گڑگڑایا تھا۔

" نوجوان۔ عدالت خود فیصلہ کرے گی کہ تم نے خون کیا ہے کہ نہیں۔ فی الحال تم پولیس حوالات چلو۔"

پھر تھوڑی دیر بعد دیپک ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے پولیس کی گاڑی میں حوالات کی اور جا رہا تھا اور ___ رمیش کے مکان سے آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔

عدالت میں وہی خاموش سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہر کوئی فرد اپنی اپنی کرسی پر جم سا گیا تھا۔ سب کے دلوں پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ سب کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور کچھ تو ایسے بھی تھے جو رو دیئے تھے۔

جج صاحب بذاتِ خود عجیب سی حالت میں تھے۔ قانون اور انصاف کے رکھوالے اِس انسان کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اور یہاں تک کہ سرکاری وکیل مسٹر شرما بھی آنکھوں پر اپنی رومال پھیر رہے تھے۔ اور — وہ نوجوان بولے جا رہا تھا۔ لگتا تھا اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں لیکن کب کے خشک بھی ہو چکے تھے اور اب اُن کے نشان ہی رہ گئے تھے۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ بغیر رُکے ہوئے۔

"انسپکٹر گپتا نے مجھے قتل کے جُرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ پولیس اسٹیشن چل کر مجھ کو پورا خونی قرار دیا گیا اور میرے ساتھ سخت برتاؤ کیا گیا۔ مجھے مارا گیا۔ پیٹا گیا۔ میں چُپ رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا میری فریاد سُنی نہیں جائے گی — میری چیخ و پکار نہیں سُنی جائے گی۔ میں پِٹتا رہا۔ روتا رہا اپنی بدقسمتی پر۔ پولیس نے میری ایک نہ سُنی۔ کیونکہ پولیس — آج کی یہ پولیس صرف ہتھکڑی لگانا جانتی ہے۔ کسی بے قصور کو مارنا اور

پیٹنا جانتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ اُس کا اصلی فرض کیا ہے۔ اُن کا کام ہے جُرم کو مٹانا۔ مجرم کو سزا دلوانا۔ غریب اور بے آسرا لوگوں کے گھر بار۔ عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہے۔

میں پوچھتا ہوں۔ آپ سے۔ اِس بھری عدالت سے۔ اور خاص کر قانون کے رکھوالوں اور انصاف کے منصفوں سے۔ کہ کہاں تھا اُس وقت قانون۔ کہاں تھی اُس وقت پولیس جب کوئی میرے گھر بار کو خاک کر رہا تھا جب کوئی میری بیمار ماں کو ٹھوکریں مار مار کر مار رہا تھا۔ جب کوئی میری غریب اور معصوم بہن کی عزت لوٹ رہا تھا۔ — اور میں — میں دیش کی خاطر خود کو قربان کرنے نکلا تھا —

میں قانون سے یہ پوچھتا ہوں کہ کتنے دیپک روز اُجڑتے ہیں۔ کتنے گھر جلائے جاتے ہیں۔ کتنی زندگیاں ختم کی جاتی ہیں روز — اور وہ سب قانون اور پولیس کے بالکل آنکھوں کے سامنے کیوں ہوتا ہے۔ کیوں قانون سماج کے اِن بڑے بڑے ٹھیکیداروں پر ہاتھ ڈالنے سے کانپتا ہے۔ کیوں قانون اُن ظالم وطن دشمن غداروں سے دامن بچا کر چلتا ہے — اِسی لئے نا کہ وہ دولت والے ہیں۔ اور آج کے اِس گندے، کھوکھلے اور جھوٹے سماج کے بڑے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ کب تک ہم اِن سماج کے بڑوں کے ہاتھوں لٹتے رہیں گے اور دیش برباد ہوتا رہے گا۔

میں نے دیش کے لئے خود کو قربان کر ڈالا۔ میں نے کبھی شیطان کی پناہ نہ لی ہمیشہ سچائی کا دامن تھاما۔ اور کبھی دولت اور عیش و عشرت کی تمنا نے میرے اصول نہ بدلے — اتنے ظلم برداشت کئے میں نے۔ لیکن پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ میں نے قانون نہیں توڑا اور وحشی درندہ نہیں بنا کیونکہ اس میں میری ماتر بھومی کی بے عزتی تھی — اور — آج جبکہ میں اِس بھری عدالت میں کھڑا کیا گیا ہوں — تو کیوں؟ میں قانون اور انصاف سے پوچھتا ہوں کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے رمیش کو نہیں مارا۔ میں اُس جیسے دیش دروہی اور کمینے آدمی کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ بہن کی تباہی نے میرے اندر جذبۂ انتقام بھڑکا دیا تھا لیکن پھر بھی میں رمیش کو مار نہ سکا تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کوئی مجھے خونی کہہ کر پکارے۔ جج صاحب۔ میں رمیش کو کیسے مار سکتا تھا جبکہ میرے پاس کوئی ہتھیار تک نہ تھا۔

میں عدالت سے اپنے لئے انصاف مانگتا ہوں۔ اُن سب وطن پر مٹنے والوں کے لئے انصاف مانگ رہا ہوں جو جان کی بازی لگاتے گھر سے بہت دور چلے گئے ہیں اور۔ اُن کے گھر میں ماں۔ بہن۔ بیوی۔ بچے اکیلے اپنی قسمت پر زار زار آنسو رو رہے ہیں۔ میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ کیا انصاف۔ قانون اور پولیس اُن کے گھروں کی حفاظت کرتی ہے۔ اُن کے ماں۔ بہنوں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتی ہے۔ میری غیر موجودگی میں میری ماں کو مار اگیا۔ اور قانون دیکھتا رہا۔ میری معصوم بہن کی عزّت لوٹ لی گئی اور اُس کو تڑپا تڑپا کر مارا گیا اور پولیس اُسے ڈھونڈھ بھی نہ سکی۔

یہ کام جو پولیس کا تھا۔ یہ کام جو قانون کا فرض ہے۔ کیا قانون اور پولیس نے پورا کیا ہے۔ نہیں۔ قانون اور پولیس بھی تو اُن لوگوں کی مدد اور دیکھ بھال کرتی ہے جن کے پاس دولت کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔

جج صاحب۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ کیا میں مجرم ثابت ہوتا ہوں۔!!

دیپک کے الفاظ نشتر کی طرح جج۔ انسپکٹر گپتا۔ سرکاری وکیل اور عدالت میں موجود سارے لوگوں کے دلوں میں چبھ رہے تھے اور دیپک نے جھوٹ بھی تو نہیں بولا تھا۔ اُس کی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی تھی لیکن عدالت پھر بھی مجبور تھی۔

—— دیپک کے خاموش ہونے کے بعد سرکاری وکیل مسٹر شرما نے اپنی عینک درست کی اور بوجھل دل سے کھڑے ہو گئے۔ دیپک کی اور ایک گہری نظر ڈال کر اُنھوں نے پھر بھری عدالت میں مُنہ کھولا تھا " یور آنر۔ مُلزم دیپک کمار نے اپنی بیتی ہوئی

زندگی عدالت کے سامنے بیان کی۔ عدالت عالیہ لگتا ہے اُس کی باتوں سے مرعوب ہوگئی ہے۔ لیکن مجرم آخرکار مجرم ہے۔ جس وقت انسپکٹر گپتا اُسے گرفتار کرنے گئے تھے رمیش کے پیٹ میں چاقو گھس چکا تھا اور وہ فرش پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ کمرے میں دیپک کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ ہم مانتے ہیں کہ رمیش نے اس کی بہن جمنا کے ساتھ زیادتی کی ہوگی لیکن اُس کے لئے دیپک کو عدالت اور قانون سے انصاف مانگنا چاہیئے تھا نہ کہ رمیش کمار کو ختم کرنا تھا۔

ملزم دیپک کے پاس اِس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ رمیش کمار اپنے ہی وار سے ختم ہوگیا۔ میں ملزم دیپک کمار کو ہر حالت میں رمیش کمار کا قاتل سمجھتا ہوں۔ اس لئے عدالت سے درخواست کروں گا کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے اور اِس کی بیتی ہوئی زندگی کو بیچ میں نہ لایا جائے۔"

اتنا سب کچھ کہہ کر مسٹر شرما خاموش ہوگئے۔ دیپک نے پھر ایک نظر مسٹر شرما سرکاری وکیل پر ڈال دی تھی۔ اُس کی نظروں میں طنز تھا۔ جیسے وہ سرکاری وکیل مسٹر شرما سے بول رہا ہو کہ "تم قانون والے اِس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہو۔ تم سے کوئی اُمید رکھنی فضول ہے۔" سرکاری وکیل نے ایک لمحہ کے لئے دیپک کی آنکھوں میں جھانکا۔ لیکن پھر انھوں نے نظریں ہٹا لیں۔ مسٹر شرما دیپک کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ دیپک کی آنکھوں سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی اور اُس کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔

عدالت میں موجود سارے لوگوں نے دیپک کے حق میں کانا پھوسی کرنی شروع کی تھی اور ہر ایک کی ہمدردی اُس کے ساتھ تھی۔ جج صاحب نے کاغذ پر سے قلم والا ہاتھ اُٹھایا اور دیپک کی اور غور سے دیکھا۔ پھر ساری عدالت میں نظریں دوڑا دیں اور پھر اپنا فیصلہ سُنایا۔

"ملزم دیپک کمار ولد شیام لال پر مقتول رمیش کمار ولد مرحوم سنبھو گھوناتھ

دائے کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ ملزم دیپک کمار اپنی صفائی میں کوئی ثبوت یا گواہ پیش نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی پولیس اِس بات کو ثابت کر سکی ہے کہ رتیش کمار پر دیپک کمار نے ہی چاقو سے وار کیا تھا۔ اِس لئے میں دیپک کمار کو اُس کا جُرم مدِّ نظر رکھتے ہوئے سزائے موت و عمر قید سے بری کرتے ہوئے ایک سال قید بامُشقّت کی سزا سُناتا ہوں۔ یہ سزا اُسی دن سے شروع ہو گی جس دن سے دیپک کمار کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اور اِس کے ساتھ ہی میں عدالت برخاست کرتا ہوں۔"

ساری عدالت دیپک کو دیکھتی ہی رہی۔ سرکاری وکیل بھاری قدموں سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ عدالت میں موجود لوگ باہر جاتے ہوئے بھی دیپک کے حق میں ہی بول رہے تھے "وہ بے قصور ہے۔ وہ دیوتا ہے۔ وہ دلیش بھگت ہے"۔ دیپک مسکراتا ہی رہا تھا۔ اُسے ہنسی آئی تھی آج کے کالے قانون پر جس نے اُس کو بے قصور ہوتے ہوئے بھی سزا دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دیپک کو بند گاڑی میں لیجایا گیا اور سنٹرل جیل کی اور پولیس کی گاڑی تیز رفتاری سے بھاگنے لگی تھی۔

شنکر سیٹھ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا اور گلاس میں بچی ہوئی شراب حلق میں اُنڈیل کر منہ پونچھ لیا تھا۔ آج وہ خوش تھا۔ اُس کی راہ کا ہر ایک کانٹا دور ہو چکا تھا۔ رتیش۔ دیپک۔ وہ اب آزاد تھا۔ کرن کے ساتھ من مانی کرنے کے لئے۔
اُس نے گلاس پھر سے بھر دیا تھا اور اُسے لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ جھومتا ہوا سا وہ دوسرے ملحقہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کرن ایک کونے میں سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی وہ۔ آنکھوں کے گرد حلقے سیاہ پڑ چکے تھے۔ بے پناہ رو رہی تھی وہ۔۔۔

"تم اداس بیٹھی ہو رانی۔ یہ اُداسی کیسی۔ شنکر لال اپنی رانی کو اُداس نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں تو خوش رہنا ہے میری جان۔ شنکر سیٹھ کی یہی تمنّا ہے۔" وہ نشے کے سمندر میں بہے جا رہا تھا۔ اور کرن۔۔۔ وہ رو رہی تھی۔ اپنی قسمت پر۔ زندگی اب اس کیلئے ایک بوجھ بن چکی تھی۔ اور وہ زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"میری زندگی میں اب کوئی خوشی نہیں۔ خوشی تو اُسی دن لوٹ لی تھی تم نے جس دن تم نے اپنا منحوس سایہ میرے خاندان پر ڈال دیا تھا۔۔۔ اب تو صرف غم ہیں اور بہلانے کے لئے آنسو اور کچھ بھی نہیں۔" کرن ہچکیاں بھرنے لگی تھی۔

"میری رانی نہیں۔ ابھی تو تجھے میرے لئے جینا ہے۔ اب تو شنکر کے راستے کی ہر رُکاوٹ دور ہو چکی ہے۔" شنکر سیٹھ نے لہجہ کو نرم بنا کر کہا تھا۔ "رمیش بھی اور دیپک بھی۔"

اور کرن یکایک چونک پڑی تھی۔ اُس کے سارے بدن میں بھونچال سا آگیا تھا۔ اور اُس نے فوراً شنکر سیٹھ سے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"دیپک۔ کیا ہوا دیپک کو۔"

شنکر نے طنز بھرے لہجہ میں جواب دیا تھا۔ "اُسے ایک سال کی قید ہو گئی اور وہ حوالات میں پڑا سڑ رہا ہوگا۔" پھر مسکرا کر کرن کی اور دیکھتا ہوا بولا تھا۔

"اب تم ہو۔ اور میں ہوں۔ اور صرف یہ جام۔ آؤ ساری دنیا کو بھول کر ہم زندگی کا پورا لطف اُٹھائیں۔"

کرن سُنتی رہی۔ سُنتی رہی۔ اُس کا سارا وجود کانپ اُٹھا تھا۔ دیپک کو قید ہو گئی ہے اُسے آج ہی معلوم ہوا تھا۔ لیکن اُس نے قصور کیا کیا تھا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ وہ بے بسی سے شنکر سیٹھ کی اور دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

"کسی کی بے بسی پر ہنسنا ہے ظالم۔ تم نے ہی رمیش بھیا کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔ تم نے ہی دیپک کا گھر بار جلا ڈالا۔ ذلیل انسان اب رہ ہی کیا گیا ہے جسے تو مٹانا چاہتا ہے۔" کرن کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"ارے ارے کیا کرتی ہو جان میری۔ تیری آنکھوں میں آنسو۔ تیرے لئے میں جان دیدوں گا رانی۔" شنکر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کاش تجھے اِن آنسوؤں کی بد دُعا لگ جائے اور پھر تو جان جائے کہ اِن میں کتنی تڑپ اور درد چھپا ہوا ہے۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ شنکر سیٹھ نے جو چاہا تھا۔ حاصل کر ہی لیا ہے۔ اب تمہیں سب کچھ بھلا کر میری محبت کا محبت سے جواب دینا ہوگا۔"

اور کرن تبھی ہنس پڑی تھی۔ طنز اور درد بھری ہنسی۔

"تمہارا خواب ہے شنکر لال۔ تم مجھے اِس جنم میں ہرگز نہیں پا سکتے۔ جس دن دیپک کا نام مٹ جائے گا۔ اُسی دن کرن بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گی اور پھر تم کس پر ظلم کرو گے شنکر سیٹھ۔"

"شنکر لال نے تمہیں گلے سے لگا لینے کے لئے حاصل کیا ہے۔ مارنے کے لئے نہیں۔ تمہیں میری محبت کا جواب دینا ہی پڑے گا۔"

"جیتے جی میرا سب کچھ دیپک کا ہے۔ دل اُسی کا۔ جان اُسی کی۔ تم مجھ سے کچھ بھی نہیں پا سکتے شنکر لال۔ آزما کر دیکھو۔" کرن پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کر بولی تھی۔ اور شنکر سیٹھ۔ وہ مکاری سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کرن کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تھا۔ "میرے پاس اِس کا بھی طریقہ ہے میری جان۔ دیپک ابھی تک زندہ ہے۔ ممکن ہے اپیل کرنے کے بعد وہ بری کر دیا جائے۔"

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" کرن کے روم روم سے آواز نکلی۔

لیکن شنکر سیٹھ نے زبردست قہقہہ لگایا۔ اور ہنستا ہی رہا۔ کرن حیران نظروں سے اُسے دیکھتی رہی تھی۔

"شنکر سیٹھ نے زندگی میں کبھی شکست نہیں دیکھی لڑکی۔ تم شنکر سیٹھ کو نہیں جان سکتیں۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے۔" کرن پریشان ہو اُٹھی تھی۔

"کل شام کو تمہارے دیپک کی لاش جیل کی سلاخوں کے اندر پڑی ملے گی اور جانتی ہو تم۔ اُسے ٹھنڈا کرنے والا کون ہو گا۔ میں یعنی کہ شنکر سیٹھ۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہیں اور ظلم کر کے کیا ملے گا۔"

جواب میں شنکر لال زور سے ہنس پڑا تھا۔

"دل کو تسکین ملے گی۔ میری آرزو ہے کہ یہ یک تڑپ تڑپ کر جان دیدے۔"

"اسے مت مارو بھگوان کا واسطہ ہے تمہیں۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" کرن اس کے سامنے گڑگڑائی تھی اور اُس کے پاؤں پکڑ کر رو پڑی تھی۔

"نہیں۔ میری جان۔" شنکر اسے اُٹھاتا ہوا بولا تھا۔ "تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ پاؤں میں نہیں۔" پھر وہ عیاری سے بولا تھا۔

"اگر تم چاہو تو میں زندگی بخش دوں گا اس کی۔ لیکن ایک شرط پر تم میرا کہنا مان جاؤ۔ بس۔"

"میں کیا کروں۔ کیا کروں۔" کرن بے بسی سے رو دی تھی۔ "میں مجبور ہے بس ہو چکی ہوں۔"

"میں کل آؤں گا تم سوچ سکتی ہو۔ یقین رکھو۔ کل تک سوہیک زندہ ہی رہے گا۔"

پھر شنکر سیٹھ اتنا کہہ کر کرن کو روتی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

رات اندھیری تھی۔ گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاروں اور اُداس سا ماحول چھایا ہوا تھا۔

دیپک سنٹرل جیل کی ایک کوٹھری میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اپنے ہی خیالوں میں کھو گیا تھا۔ اُس کا دماغ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں کئی خیالات آتے اور جاتے۔ وہ سوچ رہا تھا ماں چلی گئی۔ جمنا بھی روٹھ گئی اور اب ایک تیسری ہستی بھی ہے جو اُس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اُسے کرن کا وجود نظر آیا۔ جو دکھ اور تکلیف میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اُس کے دل میں کھلبلی سی اُٹھی۔ وہ سوچتا رہا کرن کے بارے میں۔ وہ کرن جو بچپن سے لے کر اب تک اُس سے محبت۔ سچی محبت کرتی آئی تھی۔

دیپک کو یاد آیا۔ محاذ پر جاتے وقت اُس نے کرن سے وعدہ کیا تھا کہ مرنے سے قبل اُس سے ضرور ملنے آئے گا۔ کرن نہ جانے کہاں ہو گی کیسی ہو گی۔ کیا پتہ شنکر سیٹھ نے اُس پر کتنے ظلم کئے ہوں گے۔ وہ یکایک بڑبڑا اُٹھا تھا۔ "نہیں کرن۔ میں ضرور آؤں گا۔ تمہیں گلے سے لگا لینے کیلئے۔ میں تجھے شنکر کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑوں گا۔ تاکہ تم سسک سسک کر جان دیدو۔ میں ضرور آؤں گا۔" اور اس کے ساتھ ہی اُسے میجر کمار کو دیا ہوا وعدہ بھی یاد آیا تھا۔

"میں ماتر بھومی کی قسم کھاتا ہوں میجر صاحب تھوڑے دنوں میں ہی لوٹ کر آؤں گا۔"

—— "تو کیا اُس کا وچن پورا نہیں ہوگا۔ اُسی کی حسرت دل میں ہی رہے گی۔ اُس نے اپنے آپ کو دیش کی عزت کے لئے وقف کیا تھا۔ کیا وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا اِس وقت۔"

دیپک کے دماغ میں زبردست ہلچل مچ اٹھی۔

"مجھے جانا ہوگا۔ کسی بھی طرح۔ کسی نیک کام کو انجام دینے کے لئے اگر میں جیل سے بھی بھاگ جاؤں گا تو کسی بھی طرح پاپی نہیں کہلاؤں گا۔" اُس کے تن بدن میں آگ سی سلگ اُٹھی اور وہ دھیرے سے اُٹھا۔ سلاخوں کے قریب جا کر اُس نے غور سے دیکھا۔ سنتری پاس ہی فرش پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دیپک کی نگاہیں کسی عقاب کی مانند چابیوں کے گچھے پر پڑ گئیں اور پھر ایک ایسا خیال بجلی کی طرح اُس کے دماغ میں کوند گیا تھا۔

اُس نے سنتری کو آواز دی۔ چند سیکنڈ بعد سنتری آنکھیں ملتا ہوا سلاخوں کے نزدیک گیا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟" وہ اُکتاتے ہوئے لہجہ میں بولا تھا۔

"مجھے ماچس کی ضرورت ہے۔ سگریٹ پیوں گا۔ مہربانی کر کے دینا۔"

سنتری نے جیب ٹٹولی۔ پھر شاید کسی جگہ سے ماچس لانے کے لئے وہ جونہی مڑا۔ دیپک کی دونوں باہیں اُس کے گلے میں پڑ چکی تھیں۔ پھر وہ اُس کا گلا دباتا گیا جب تک کہ وہ بیہوش ہو کر اُس کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔ پھر اُس نے اُس کے کمربند میں لٹک رہے چابی کے گچھے کو کھینچ لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ سنتری دھڑام سے فرش پر گر پڑا تھا۔ دیپک قفل میں چابی گھما کر اُسے کھول چکا تھا۔ دروازہ دھکیل کر اُس نے دور دور تک نظریں ڈالیں اور پھر باہر چھلانگ لگا دی۔

تھوڑی دیر بعد چاروں اور سے سپاہی چلاتے ہوئے پھر رہے تھے۔ چاروں اور ٹارچوں کی روشنی پڑ رہی تھی اور وہ بھاگے ہوئے قیدی کو ڈھونڈ رہے تھے اور دیپک دور سنسان گلیوں میں پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

شنکر نے اندر داخل ہو کر کرن پر ایک گہری نظر ڈال دی تھی اور پھر نرم لہجہ میں اُس سے بولا تھا۔

"مجھے اُمید ہے تم نے فیصلہ کر لیا ہو گا۔ بولو کیا فیصلہ ہے تمہارا۔ دیپک کی زندگی یا اُس کی موت۔"

"دیپک جیل سے چھوٹ جائے گا؟" کرن نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ ممکن ہے اُس کی اپیل پر غور کیا جائے۔"

"تم اُسے مار ڈالو گے؟" کرن کانپ کر بول اُٹھی تھی۔

"اُسے میٹھی نیند سُلا دوں گا ہمیشہ کے لئے۔" شنکر مکاری سے بولا۔

"لیکن کیوں۔ تم اُس کے دُشمن کیوں بن رہے ہو؟" کرن نے درد بھرے لہجہ میں کہا تھا۔

"تاکہ میرے راستہ کا ہر ایک کانٹا دور ہو جائے۔"

"اگر میں تمہارا کہا مان جاؤں تو؟"

"دیپک کی زندگی بخش دوں گا۔"

"تمہارا کیا بھروسہ۔ تم جیسے ذلیل لوگوں کے پاس ایمان نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"
کرن نے نفرت سے کہا تھا۔

"شنکر سیٹھ پر بھروسہ کرو لڑکی۔ اس کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں۔"

کرن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُسے چکر سے آ رہے ہوں۔ اُس نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ پھر درد سے بھری آواز میں وہ شنکر سے بولی تھی۔ "ٹھیک ہے۔ اگر میری جان دینے سے دیپک کی زندگی بچ سکتی ہے تو میں تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔" اور اپنی بات ختم کرنے کے ساتھ ہی وہ بیہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

شنکر سیٹھ خوشی سے پاگل ہو اُٹھا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں بسی ہوئی حسین لڑکی اُس کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار تھی۔ اُس نے الماری سے جھپٹ کر بوتل اور گلاس نکالا اور غٹاغٹ دو تین گلاس چڑھا گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنی ہوس بھری نظریں کرن کے حسین جسم پر ڈال دیں اور سسکاری لے کر رہ گیا۔

دفعتاً آگے بڑھ کر اُس نے کرن کو بازوؤں سے اُٹھا کر بستر پر ڈال دیا تھا اور پھر اُس پر جھکتا چلا گیا تھا۔ کرن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ لمحہ بہ لمحہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ اُس کے جسم سے کوئی رُوح کھینچ رہا ہو۔ اُس کے سارے بدن میں کپکپی سی طاری ہو چکی تھی۔ شنکر سیٹھ نے اُس کے ہاتھ کا ایک طویل بوسہ دیتے ہوتے کہا تھا۔

"میری جان شنکر سیٹھ ایک تیر سے دو شکار کرنا جانتا ہے۔ تم بالکل نادان اور بھولی ہو۔ تم سمجھتی ہو دیپک جیل سے چھوٹ جائے گا۔" اُس نے پھر قہقہہ لگایا تھا۔ لیکن اس بار اُس کا قہقہہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اُس کے بالکل سامنے دیپک کھڑا

ہوا تھا۔ اور اُسے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"دیپک جیل سے بھی چھوٹ سکتا ہے شنکر سیٹھ۔"

"تم آگئے۔ چلو ٹھیک ہوا۔ تمہاری موت خود تم کو میرے پاس کھینچ لائی ہے۔" شنکر بولا تھا۔

"تم بھگوان نہیں ہو شنکر سیٹھ جو زندگی لینے کا دعویٰ کرو۔"

"دیکھ رہے ہو اسے۔" شنکر طنز سے بولا۔ "یہ کرن ہے — تمہاری کرن — لیکن اب میری ہے۔ اس نے میری محبت تسلیم کر لی ہے۔"

دفعتاً دیپک جھپٹ کر کرن کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ اب نیلا ہو رہا تھا۔ دیپک اُسے ہلانے لگا "کرن آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں آیا ہوں۔ تمہارا دیپک۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں نے وعدہ جو کیا تھا کہ ضرور آؤں گا۔" کرن بے سُدھ پڑی رہی۔ دیپک اُسے جھنجھوڑتا رہا۔ ایک لمحہ کے لئے کرن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے دیپک کو دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ اور پھر اپنا کمزور ہاتھ دیپک کے ہاتھوں میں دے دیا۔

"تم آگئے دیپک۔ لیکن تم نے دیر کر دی — میں کتنی خوش ہوں کہ تیری زندگی بچ گئی۔"

"ہاں کرن۔ لیکن۔ یہ تیری آواز گھٹتی کیوں جا رہی ہے۔ تیری آنکھیں بند کیوں ہوتی جا رہی ہیں۔ کرن تمہارا چہرہ نیلا سا کیوں ہو رہا ہے۔ ہوش میں آؤ کرن۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔"

"دیپک۔" کرن کی سانسوں کی رفتار اچانک دھیمی پڑ گئی — "میں نے اس ظالم سے چھٹکارا پانے کی غرض سے —" اُس کا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ اور دیپک چلا اُٹھا۔ وہ

کانپ کر رہ گیا تھا "تم۔ تم نے یہ کیا کیا کرن۔ تھوڑا اور انتظار کیا ہوتا میرا۔"

"میرے اور نزدیک آؤ دیپک" کرن رُک رُک کر بولی ـــ "اور قریب آؤ دیپک۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ صرف اندھیرا ہے۔ دی ـــ پ"۔ پھر وہ کچھ بھی بول نہ پائی تھی۔ اور اُس کی گردن لڑھک گئی تھی۔ اُس نے خود کو اپنے پیار پر قربان کر دیا تھا۔ دیپک نے اُس کی بند مٹھی کھولی۔ اور پھر ٹھٹھک گیا تھا۔ اُس کی مٹھی سے زہر کی شیشی گر کر فرش پر چور چور ہو گئی تھی۔ دیپک رو دیا تھا۔ درد بھری آوازیں ـــ

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا کرن۔ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ تم نے تو زندگی بھر ساتھ دینے کا وچن دیا تھا۔ تم مجھے راہ میں چھوڑ کر ہی چلی گئیں۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا کرن۔"

"اِس نے جو بھی کر لیا سو کر لیا۔ اب تو اپنی فکر کر کم عقل۔ تیری ہی وجہ سے میں نے کرن کو کھویا ہے۔" شنکر لال نے پستول نکال کر دیپک کی اور تان دیا۔ اور دیپک۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اُس نے شنکر سیٹھ کو خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔

"کمینے"۔ شنکر سیٹھ کانپ کر رہ گیا تھا دیپک کی بات پر۔

"شیطان ـــ ذلیل تو اب تک کیوں زندہ ہے۔ تجھے تو بہت پہلے مر جانا چاہیئے تھے۔ تم وطن دشمن ہو خونی ہو۔ تم نے بہتوں کو بے موت مار ڈالا ہے۔ تجھے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"آگے قدم مت بڑھاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔" شنکر غرّا کر بولا تھا۔ اور دیپک نے موقعہ پا کر اُس پر کرسی اُچھال دی۔ کلائی پر چوٹ لگی پستول چھوٹ کر دُور جا گرا تھا۔ اور دیپک وحشی انداز میں اُس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ لگتا تھا اُس کے ہاتھوں سے شنکر سیٹھ کو آج کوئی نہیں بچا سکے گا ـــ شنکر سیٹھ نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن دیپک

اُسے مارتا ہی رہا۔ جب تک کہ وہ بیہوش ہو کر گر نہ پڑا تھا۔ اُس کے سر اور دوسرے اعضاء سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اُس نے گرنے سے پہلے دُہائی مانگی تھی لیکن دیپک نے اُسے نہیں چھوڑا تھا۔

دیپک نے کرن پر نظر ڈالی تھی اور بُڑبُڑایا تھا۔ تجھے اِس وقت شمشان نہیں لیجا سکتا کرن۔ کیونکہ میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں۔ پھر بھی تجھے اِس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ تیری چتا جلا کر ہی جاؤں گا۔

اُس نے آتشدان سے جلتی ہوئی لکڑی نکال کر کرن کے بیڈ سے لگا دی۔ کپڑے میں آگ سُلگ اُٹھی اور رفتہ رفتہ پھیلتی ہی گئی۔ شنکر سیٹھ ایک اور بیہوش پڑا تھا۔ اور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد دیپک بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل پڑا۔ اپنی منزل کی اور۔۔۔ جو اُسے بُلا رہی تھی۔ اُس کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے۔ اور اُدھر شنکر سیٹھ کا بنگلہ۔ عالیشان عمارت چاروں اطراف سے آگ میں گھر گئی تھی اور اسی آگ میں شنکر سیٹھ ہوش میں آ کر چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا کہ کوئی اُسے بچا لے۔ وہ زندہ جلا جا رہا ہے۔ لیکن کوئی اسے نہیں بچا سکا تھا۔ آہستہ آہستہ عمارت کی چھت گرنی شروع ہو گئی اور پھر جب آگ بجھانے والی گاڑی موقعہ پر پہنچی تھی۔ شنکر سیٹھ زندہ ہی چتا میں بھسم ہو چکا تھا۔

دیپک نے ادب سے میجر کمار کو سلامی دی۔ میجر کمار نے مسکرا کر سلامی کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم آ گئے دیپک۔"

"جی ہاں سر۔ وچن پورا ہوا میرا۔" دیپک کا لہجہ درد سے بھرا ہوا تھا۔ میجر کمار اس بات کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے بھی نرمی اور پیار سے پوچھا۔

"تمہارے گھر والوں کا کیا ہوا۔ تمہاری بہن تو ٹھیک ہے نا؟"

"سب کچھ مٹ چکا ہے میجر صاحب۔ دنیا نے میری دنیا جڑ سے ہی اُکھاڑ ڈالی۔"

"کیا مطلب۔" میجر کمار چونک پڑے تھے۔ پھر دیپک نے بھرائی ہوئی آواز میں ساری داستان دُہرا دی اور میجر کمار بے حس و حرکت اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اُن کا دل بھاری ہو گیا تھا اور آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ دیپک نے پھر کہا تھا۔

"اب تو میری ایک ہی منزل ہے میجر صاحب۔ میں نے جیل سے بھاگ کر زندگی میں پہلی اور آخری غلطی کی ہے۔ لیکن میں مجبور تھا۔ میں دلشی کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی دلشی کے لئے ہی وقف کر دی ہے۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں۔ یا تو

جیت کر ہی واپس لوٹوں گا اور جیل میں سزا کاٹوں گا۔ یا یہیں پر جان دیدوں گا۔ ایسا آپ پر فیصلہ ہے سر۔ آپ چاہیں تو مجھے گرفتار کر کے واپس حوالات بھیج سکتے ہیں۔"

میجر کمار اِس بیباک، نڈر اور سچے سپاہی کی صاف گوئی پر قربان ہو گیا۔

"نہیں دیپک۔ اِس وقت یہاں پر تمہاری سخت ضرورت ہے۔ میں اندھے قانون کی خاطر دیش کی عزّت خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ میں جانتے ہوئے بھی کہ تم جیل سے بھاگ کر آئے ہو۔ تمہیں واپس نہیں بھیج سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم دیش کے کتنے کام آسکتے ہو۔"

دیپک سلامی دے کر مُڑ گیا۔ میجر کمار اُسے دُور تک دیکھتے رہے اور پھر اُن کے ہونٹوں سے بڑبڑا کر نکلا تھا۔

"تم جیسے بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ میرے بیٹے تم دیوتا ہو۔۔۔ وطن کو تم پر ناز ہے۔"

میجر کمار کو اچانک اطلاع مل گئی تھی۔ دشمن پوسٹ نمبر ۶ کی طرف تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اور بھاری تعداد میں ہے۔ اُنھوں نے فوراً حکم دیا۔

"جوانوں۔ فوراً پوسٹ نمبر ۶ پر پہنچ کر مورچے سنبھالو۔ آج سب سے آگے دیپک کمار ہوگا۔ دیپک کمار پوسٹ نمبر ۶ تمہاری کمانڈ میں رہے گا۔ حوصلہ رکھو اور دشمن کے دانت کھٹے کر دو۔"

تھوڑی دیر بعد ہی فوج کی چھوٹی سی بٹالین دیپک کی قیادت میں پوسٹ نمبر ۶ کے مورچے سنبھال رہی تھی۔ دشمن بھاری تعداد میں موجود تھا۔ اور حملہ شدید ہو رہا تھا۔

دیپک نے جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دونوں اطراف سے فائرنگ ہوتی رہی۔ بم برستے رہے۔ لیکن دشمن پیچھے نہیں ہٹا اور آگے ہی بڑھنے لگا تھا۔۔۔ وہ تڑا تڑ گولیوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ لگتا تھا اُن کے پاس ہتھیار زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ دیپک سوچ میں پڑ گیا تھا۔ حملے کو کیسے روکا جائے۔ تبھی میجر کمار کی

آواز پیچھے سے آئی تھی۔

" دیپک کمار۔"

" یس سر۔"

" اس حملے کو روکنا سخت مشکل ہے دیپک۔ دشمن نے بھاری تعداد میں ہتھیار، گولہ بارود جمع کر رکھا ہے۔ لگتا ہے اسی جگہ کہیں آس پاس ہی اُن کا ایمونیشن ڈیپو موجود ہے۔ ہمارے پاس اس وقت ہتھیار کم تعداد میں موجود ہے۔ آخر کب تک اس طرح لڑیں گے۔ ہتھیار ختم ہونے ہی والا ہے اور اوپر سے ہتھیار آنے میں ابھی وقت لگے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا۔"

" تو کیا ہم پوسٹ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور اس پوسٹ پر دشمن کا قبضہ ہوگا؟" دیپک نے پوچھا تھا۔

" نہیں" میجر کمار جوش میں بھر کر بولے تھے۔" ہم بھارتی ہیں۔ ہتھیار کے بغیر بھی لڑتے رہیں گے۔ جب تک جان باقی ہے۔ لڑنا ہی ہمارا کام ہے دیپک۔"

تبھی دیپک کسی خیال سے چونک پڑا تھا۔ اور فوراً میجر کمار سے بولا تھا۔

" سر۔ اگر دشمن کا ایمونیشن ڈیپو ہی اُڑا دیا جائے تو کیا ہماری جیت ہوگی؟"

اور میجر کمار اُس کی بات کو سُن کر سناٹے میں آ گئے تھے۔ دیپک نے کتنی بڑی بات بولی تھی لیکن کتنی نامکن۔

" اس میں کوئی شک نہیں دیپک کمار کہ جیت پھر ہماری ہو گی کیونکہ ہتھیار کے بغیر کوئی نہیں لڑ سکتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سیکٹر کا ایمونیشن ڈیپو اسی جگہ کہیں موجود ہے۔ دشمن نے سارا گولہ بارود ہتھیار یہیں کہیں جمع کر رکھا ہے۔ اگر وہ برباد کر دیا جائے تو دشمن کی اس سیکٹر میں ہار ہو جائے گی اور ہم آگے مارچ

کر سکتے ہیں ۔۔ لیکن یہ بات بالکل ناممکن ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ سب دیپک؟"

"میجر صاحب۔ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ میری منزل مجھے بلا رہی ہے۔ آپ فکر مت کیجئے۔ اس سیکٹر میں ہماری جیت ہو گی۔"

میجر کمار اسے حیران نظروں سے دیکھتے رہے۔ "تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو دیپک۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔"

دیپک صرف مسکرایا تھا ۔۔ اچانک دشمن کی اور سے فائرنگ رک گئی تھی۔ میجر کمار نے بھی حملہ روکنے کا حکم دیا تھا۔

"سب رات کو جاگیں گے۔ تیار رہیں گے۔ کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔" میجر کمار نے سب کو ہدایات دی تھیں۔

وہ رات اندھیری تھی۔ چاروں اور پُراسرار اور خاموش سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاروں اور اُداس سا ماحول تھا۔ دشمن خاموش تھا۔ اور جنگ بندی لائن کے پوسٹ نمبر ۶ کے اِس طرف بھارت کے بہادر جانباز جاگ رہے تھے۔ نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ لگتا تھا وہ انسان نہیں لوہے کے بنے ہوئے جانباز ہوں۔ ہر ایک چوکنّا تھا۔ تیّار تھا۔ ہر ایک کا حوصلہ بلند تھا۔

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دیپک نے قدم بڑھایا۔ پوسٹ نمبر ۶ کی حدود تک وہ چلا آیا تھا۔۔۔ دوسری طرف دور تک نظریں ڈال دیں۔ اُس نے دشمن بے خبر پڑا تھا۔ اُن کے خیموں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں خاموش فضا میں چمک رہی تھیں۔ دُور کہیں کچھ انسانی سائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ پہرہ دے رہے ہوں۔ دیپک نے ایک بار چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑائیں اور پھر مطمئن انداز میں قدم آگے بڑھایا۔۔۔ تھوڑا چل کر خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ دیپک ٹٹولتا ہوا جا رہا تھا۔ کسی جگہ اُس کا کپڑا

کانٹوں میں پھنس جاتا تو وہ جھک کر اُسے جھٹک دیتا اور پھر آگے بڑھتا۔ کئی بار وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا لیکن وہ جلدی سے سنبھل گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر خراشیں آگئی تھیں اور وہاں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ اُسے زبردست جلن ہو رہی تھی لیکن وہ رُکا نہیں تھا۔ آگے رینگتا ہی گیا۔ اب وہ اپنی حدود سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ اور اُس کے دیش کی دھرتی کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر مُڑ کر دیکھا تھا اور اندھیرے میں آگے رینگنے لگا تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش تھی۔ وہ جس کام کو کرنے کے لئے نکلا تھا اُس میں یقینی موت تھی۔ لیکن اُسے کوئی ڈر نہیں تھا اُسے جان کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کا پلان پورا ہو کر رہے تو جان کی پرواہ نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی جب وہ کچھ اور چلا آیا تو اُسے دشمن کے خیموں کی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔ ایک خوشی کی لہر سی اُس کے سارے بدن میں دوڑتی گئی تھی۔

اندھیرے میں ہی نظریں دُور تک پھیلا کر اُس نے غور سے دیکھا۔ اُسے بہت سے خیمے نظر آئے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ ایمونیشن ڈیپو کون سا ہوگا۔ سبھی خیموں کی روشنیاں کمزور تھیں سوائے ایک کے۔ جو کچھ بڑا سا دکھائی دیتا تھا۔ اور اُس کے چاروں طرف دس پندرہ سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ دیپک سمجھ گیا کہ ایمونیشن ڈیپو کے سوا وہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ باقی خیموں میں دشمن بے خبر پڑا تھا۔

اب دیپک جس جگہ کھڑا تھا اُس جگہ سے خطرناک مراحل سے پار کرنا تھا۔ کس طرح وہ اُس مخصوص جگہ تک پہنچ جائے۔ کس طرح اُن پہریدار جوانوں کو وہاں سے

ہٹا دے۔

دیپک کچھ اور رینگتا گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ دشمن کے ایک خیمے کے بالکل نزدیک تھا۔ اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ اچانک ٹھوکر کھا کر وہ گر پڑا اور کچھ آواز سی ہوئی۔ اور تبھی دشمن کی گرج اُسے سنائی پڑی۔

"ہالٹ۔ ہوازدیر۔"

دیپک جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ اپنا سانس روکے ہوئے۔ دشمن قریب آیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن رُک سی گئی۔ اُسے اپنی موت قریب دکھائی دی۔ اور وہ پسینہ میں نہا گیا تھا۔ دشمن کے سپاہی نے قریب آکر دیکھا۔ اور واپس مُڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیپک پھر اُٹھا اور اُس مخصوص جگہ کو غور سے دیکھنے لگا اور تبھی اُس کے سارے جسم پر تیز روشنی پڑی اور ساتھ ہی گولی بھی چلی جو دیپک کے کندھے کو چھیلتی کرتی ہوئی چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھاڑیوں میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ کانٹے اُسے چبھو رہے تھے۔ لیکن وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ درد کی ٹیس اُس کے سارے بدن کو بے قرار کر گئی تھی۔ لیکن وہ برداشت کر گیا اور چپ چاپ پڑا رہا۔ دشمن کے سپاہی کتوں کی طرح اُسے جھاڑیوں میں ڈھونڈھنے لگے۔ اُس کے دماغ میں ایک فوری خیال آیا۔ اُس نے جھاڑیوں کے بیچ میں سے دو تین چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھا کر ایک طرف اُچھال دیئے۔ اُدھر دھپ سے گرنے کی آواز پیدا ہوئی اور دشمن کے چار پانچ سپاہی اُس طرف دوڑ پڑے۔ دیپک نے یہ ترکیب اچھی دیکھی۔ دو تین پتھر اُٹھا کر دوسری طرف اُس نے پھر اُچھال دیئے۔ دشمن کے مزید کچھ سپاہی اُس طرف جھپٹ پڑے۔ دیپک نے سر اُٹھا کر دیکھا ایمونیشن ڈپو کے گرد مسلح پہرہ ٹوٹ چکا تھا اور دشمن اُسے جھاڑیوں میں ڈھونڈھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہی موقعہ دیپک